فہرست مضمون نگاران معارف

جلد ۷۷

جنوری سنہ ۱۹۵۶ء تا جون سنہ ۱۹۵۶ء

(بہ ترتیب حروف تہجی)

شمار	اسماء گرامی	صفحہ	شمار	اسماء گرامی	صفحہ
۱	مرزا احسان احمد صاحب بی اے ایل ایل بی وکیل	۹۸، ۱۸۰	۹	جناب مولانا عبدالسلام صاحب ندوی	۴۴۶
۲	جناب ڈاکٹر خواجہ احمد صاحب فاروقی ایم اے پی ایچ ڈی، ریڈر شعبۂ اردو دہلی یونیورسٹی	۲۲۴	۱۰	جناب ڈاکٹر شیخ عنایت اللہ صاحب ایم اے پی ایچ ڈی (لندن) شعبۂ عربی و اسلامیات، گورنمنٹ کالج، لاہور	۸۵
۳	جناب ادیب ایم اے لکچرار اردو رابرٹسن کالج، جبل پور	۲۴۵	۱۱	جناب مبارز الدین صاحب رفعت ایم اے لکچرار گورنمنٹ کالج گلبرگہ	۴۲۲
۴	مولانا سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ	۳۹۰	۱۲	مولوی حافظ مجیب اللہ صاحب ندوی رفیق دارالمصنفین	۳۴۲ ۴۰۵
۵	سید صباح الدین عبدالرحمن صاحب ایم اے علیگ	۱۴۷، ۱۶۰ ۳۱۶			
۶	جناب مولوی ضیاء الدین صاحب اصلاحی	۲۵۹	۱۳	جناب ڈاکٹر محمد احمد صاحب صدیقی لکچرار، عربی، الہ آباد یونیورسٹی	۳۵۹
۷	جناب عبدالباقی صاحب ایم اے صدر شعبۂ فلسفہ گورنمنٹ کلکتہ کالج	۳۷۷	۱۴	جناب محمد اشرف خاں صاحب ایم اے لکچرار عربی اسلامیہ کالج پشاور	۵
۸	جناب مولانا سید عبدالرؤف صاحب اورنگ آبادی	۲۱۱ - ۲۷۷			

شعراء

فہرست مضامین معارف

(جلد ۷۷)

جنوری ۱۹۵۶ء تا جون ۱۹۵۶ء

(بہ ترتیب حروف تہجی)

جلد ۷۷ ماہ جمادی الاول ۱۳۷۵ھ مطابق ماہ جنوری ۱۹۵۶ء عدد ۱

مضامین

مقالات

تلخیص و تبصرہ

آثار علمیہ و تاریخیہ

ادبیات

بسم اللہ الرحمن الرحیم

شذرات

فرقہ پرستوں کی جانب سے مسلمانوں کی دل آزاری کا سلسلہ برابر جاری ہے، اور حکومت کے توجہ نہ کرنے کا نتیجہ یہ ہے کہ اب مسلمانوں کی سب سے محترم و محبوب ہستی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس تک گستاخی کی نوبت پہنچ گئی ہے جس سے زیادہ مسلمانوں کی دل آزاری تصور میں نہیں آسکتی، اور جس کو کوئی مسلمان کسی حالت میں بھی برداشت نہیں کرسکتا، جس بدبخت نے یہ گستاخی کی ہے اور جن اخباروں نے یہ اشتہار شائع کیا ہے، انھوں نے تنہا مسلمانوں کی دل آزاری نہیں کی بلکہ اپنی قوم، اپنی حکومت اور انسانیت کے نام پر بٹہ لگایا، یہ غنیمت ہے کہ اس مرتبہ حکومت نے ڈھیل سے کام نہیں لیا اور مجرم کو فوراً گرفتار کرلیا ہے، اور اس پر مقدمہ چلائے گی، اس ننگ انسانیت کو اس جرم کی ایسی سزا ملنی چاہیے جس سے دوسروں کو عبرت اور آیندہ کسی شرارت پسند کو اس قسم کی جرأت نہ ہو،

یہ کوئی نادانستہ حرکت یا اتفاقی واقعہ نہیں ہے، بلکہ لکھنؤ میں شدھی گیہ اور جن سنگھ کے سلسلہ میں جو طوفان بے تمیزی برپا ہوا، فرقہ پرستی کی آگ کو جس طرح مشتعل کرنے کی کوشش کی گئی، اور حکومت نے جس چشم پوشی سے کام لیا اسی کا لازمی نتیجہ ہے، اگر وہ شروع سے ان فتنوں کو روکتی تو اسکی نوبت ہی نہ آتی، اگر ایک مرتبہ حکومت نے مجرم کو سزا دے بھی دی تو اس سے اس قسم کے جرائم کا مستقل انسداد نہیں ہو سکتا، اس کے لیے پیشوایان دین کی توہین کی دفعہ کو اور زیادہ سخت اور مؤثر بنانے کی ضرورت ہے جس کی رو سے ہر اس شخص کو مدعی بننے کا اختیار ہو جس کے پیشوا کی توہین کیجائے، اور سزا کو بھی اور زیادہ سخت کیا جائے، اس کے بغیر اس فتنہ کا پورا تدارک نہیں ہو سکتا، اس قسم کی دفعہ ملکی مفاد کے نقطہ نظر سے بھی ضروری ہے اور اس کا فائدہ ہر فرقہ کو پہنچے گا۔

مولوی اقبال احمد خاں صاحب سہیل کی وفات کا حادثہ ابھی تازہ تھا کہ اعظم گڈھ کی ایک اور نامور شخصیت اٹھ گئی، اور ملک کے مشہور مصنف اور صاحب قلم مولانا اسلم صاحب جیراجپوری نے ۲۸ دسمبر کو انتقال کیا، ان کا وطن اعظم گڈھ کا مشہور

گاؤں جیراجپور تھا، انکے والد مولانا سلامت اللہ صاحب جماعت اہل حدیث کے ممتاز علماء میں تھے، نواب صدیق حسن خاں نے بھوپال میں جن علماء کو جمع کیا تھا، ان میں ایک مولانا سلامت اللہ صاحب بھی تھے، وہ بھوپال کے عربی مدارس کے مہتمم تھے، اس لیے مولانا اسلم صاحب کی تعلیم و تربیت وہیں ہوئی، تکمیل تعلیم کے بعد وہ پیسہ اخبار لاہور کے عملۂ ادارت میں شامل ہو گئے، پھر علیگڈھ کالجیٹ اسکول میں عربی کے مدرس مقرر ہوئے، کچھ دنوں تک لٹن لائبریری کے شعبۂ شرقیات کے نگراں رہے، اور عربی فارسی کتابوں کی فہرست مرتب کی، مسلم یونیورسٹی قائم ہونے کے بعد شعبۂ عربی کے لکچرار ہو گئے، پھر جامعہ ملیہ کے قیام کے بعد یونیورسٹی سے قطع تعلق کر کے جامعہ ملیہ چلے آئے اور تاریخ اسلام کے پروفیسر مقرر ہوئے، اور آخر عمر تک جامعہ سے وابستہ رہے، اور بالآخر اسی کی خاک کا پیوند ہوئے۔

مرحوم صاحب علم و نظر عالم تھے، اگرچہ انکی تعلیم پرانے اور پھر اہلحدیث کے ماحول میں ہوئی تھی لیکن وہ بڑے روشن خیال اور زمانہ کے حالات و رجحانات سے باخبر تھے، اور کسی سوسائٹی میں اجنبی نہیں معلوم ہوتے تھے، تالیف و تصنیف کا ذوق ابتدا سے تھا، اسلامی تاریخ پر تاریخ الامت، سوانح عمرو بن العاص، تاریخ نجد، حیات حافظ اور حیات جامی وغیرہ بہت سی کتابیں لکھیں، ان میں تاریخ الامت زیادہ مقبول ہوئی، انکے مضامین کا ایک مجموعہ نوادرات کے نام سے چند سال ہوئے ادارہ طلوع اسلام کراچی سے شائع ہوا ہے، شعر و ادب کا بھی ستھرا مذاق رکھتے تھے، اور بڑی شگفتہ اردو لکھتے تھے کبھی کبھی قومی و ملی، تاریخی نظمیں بھی لکھتے تھے، انکا ایک مختصر مجموعہ "جواہر ملیہ" کے نام سے شائع ہو چکا ہے، مسلکاً اہل قرآن کیطرف مائل تھے، مگر منکرین حدیث کی طرح غالی نہ تھے، اور سنت متواترہ کو مانتے تھے، عملاً دیندار اور طبعاً بڑے سادہ، متواضع اور خلیق تھے، انکی خوبیوں کے طفیل میں اللہ تعالیٰ انکی لغزشوں سے درگذر کر کے اپنی مغفرت سے سرفراز فرمائے۔

استداد زمانہ کے ساتھ سرکاروں کی مخالفت رفتہ رفتہ کم ہو رہی ہے، دوسرے صوبوں کی لسانی اقلیتوں کے حقوق کے مسئلہ نے اور بھی کم کر دی ہے، اور اب پنڈت جواہر لال نہرو اور ان کے جیسے روشن دماغ لوگوں کے علاوہ بھی مختلف جماعتوں کے ممتاز لوگوں کی زبانوں سے جن میں وزرا بھی شامل ہیں، اردو کا اعتراف ہونے لگا ہے، اور ان لوگوں کی زبانوں پر بھی اس کا نام آنے لگا ہے جنکو اسکے نام سے چڑھ تھی، اسمیں پنڈت جواہر لال کے بیانات اور انکی تقریروں کو بڑا دخل ہے،

لکھنؤ کے طلبہ کے اردو کنونشن اور صوبائی اردو کانفرنس کی روداد، اور سرکاری کاموں میں ہندی زبان کو

جلد رائج کرنے کے مسئلہ پر اسمبلی کی تقریریں اس کا ثبوت ہیں، کنونشن اور کانفرنس دونوں میں ہر فرقہ کے آدمیوں نے حصہ لیا اور اردو کی حمایت میں پرزور تقریریں کیں، کنونشن کا افتتاح ہمارے صوبہ کے گورنر کے ام منشی نے کیا تھا، اور اردو کانفرنس کی صدارت صوبہ کے وزیر اعظم صاحب کے چھوٹے بھائی پری پورنانند کی تھی، پری پورنانند جی اردو کے ذوق شناس اور پرانے حامی ہیں، اس لیے انھوں نے اردو کے بارہ میں اپنی صدارتی تقریر میں جو خیالات ظاہر کیے وہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے، مگر گورنر صاحب نے اس بارہ میں جو کلمات خیر ارشاد فرمائے، وہ انکی زبان سے بالکل نئی بات اور اردو کے لیے فال نیک ہے، گو انھوں نے اردو کے بجائے دیوناگری رسم الخط قبول کر لینے کا مشورہ دیا ہے، اسمبلی میں ہندی کے بارہ میں جو مباحثہ ہوا، اس میں اکثر مقررین نے اس صوبہ میں اردو کی حیثیت اور اس کی ضرورت کو بھی تسلیم کیا۔

گو ہندوؤں کی ایک جماعت اردو کو اپنی مادری زبان سمجھتی اور برابر اس کی حمایت کرتی رہی اور اس نے اردو کی تحریکوں میں پورا حصہ لیا، بلکہ اس کی رہنمائی تک کی، مگر کچھ دنوں پہلے تک اردو کی مخالفت ایسی تند ہو گئی تھی اور اس کو ایسا فرقہ وارانہ رنگ دیدیا گیا تھا کہ جو لوگ اردو کو اپنی مادری زبان سمجھتے تھے، ان میں بھی کم لوگ علانیہ اس کے اظہار کی جرأت کر سکتے تھے، مگر اب صورت حال بدل گئی ہے، اور اردو کے حامیوں کی تعداد برھتی جاتی ہے، اور اس کی حمایت میں ہر فرقہ اور ہر طبقہ کے اشخاص کی آوازیں بلند ہونے لگی ہیں، اسکی تائید میں مضامین نکل رہے ہیں جن میں مختلف صوبوں کے وزرا بھی شامل ہیں، پنجاب یونیورسٹی نے اردو کو قریب قریب ہندی اور انگریزی کے برابر حقوق دیے ہیں جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اردو کی مخالفت کا جوش اب ختم اور اس کے بارہ میں صحیح نقطۂ نظر پیدا ہو رہا ہے، مگر ابھی تک ہمارے صوبہ کے وزیر اعظم صاحب اپنی جگہ پر قائم ہیں لیکن ان کو بھی ایک نہ ایک دن رائے عامہ کے سامنے جھکنا پڑے گا، گو یہ حالات بہت امید افزا ہیں، مگر ابھی اصل منزل مقصود دور ہے، اور اردو کے حامیوں کو اس وقت تک اپنی جد و جہد جاری رکھنا ہے جب تک اردو کو علاقائی زبان نہ مان لیا جائے، اور اسکو علاقائی زبان کے سارے حقوق نہ مل جائیں، محض معمولی مراعات اور سہولتوں کا ملنا کافی نہیں ہے۔

مقالات

سُلوک سلیمانی پر ایک اجمالی نظر

از جناب اشرف خانصاحب ایم اے لکچرار عربی اسلامیہ کالج پشاور

(۵)

صبر و شکر انسان کی زندگی میں دو ہی قسم کے مواقع پیش آتے ہیں، خوشی کے یا رنج کے۔ ان مواقع پر ان کے حقوق کا اس طرح ادا کرنا جس سے اللہ رب العزت راضی ہوں، شکر و صبر ہے، مثلاً خوشی کے موقع پر اس کو آقا کی دین سمجھ کر شکر ادا کیا جائے اور مصیبت کو بھی اللہ تعالیٰ کی جانب سے سمجھکر صبر کیا جائے، حضرت والا رحمہ اللہ تعالیٰ نے صبر کی یہ تشریح فرمائی تھی کہ "خواہش نفس کو روک کر ہر حال میں حکم الٰہی پر چلنا صبر ہے" اور اس معنی میں صبر پوری زندگی پر حاوی ہو جاتا ہے، اور مصیبت پر تحمل و برداشت کرنے کا جو عام مفہوم لیا جاتا ہے، اس کے متعلق فرمایا کہ صبر یہ ہے کہ دل سے بھی کوئی شکایت نہ ہو، اگر کوئی بڑھیا ظالم سے بدلہ نہیں لے سکتی اور اسے بد دعا دے دیتی ہے تو یہ صبر نہیں۔ صبر جمیل یہ ہے کہ شکایت کا نام تک نہ آئے، فرماتے تھے کہ صبر پر بے حساب اجر کا وعدہ ہے اور شکر پر صرف زیادتی کا۔ اس طرح صبر شکر سے بڑھکر ہے، ایک طالب کو صبر کی تلقین کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں :-

"بے شبہہ دنیاوی مشکلات ہمت پست کر دیتی ہیں، مگر صبر و استقامت اور ہمت وعز

اور مجاہدہ کے مواقع بھی تو یہی ہیں، یہ صورت نہ ہوتی تو صبر و ثبات کے کمالات کیونکر حاصل ہوتے، اور اجر و رضائے الٰہی کے انعامات کیونکر ہاتھ آتے"۔

دنیاوی مشکلات سے طبعاً متاثر ہونے کے بارہ میں اسی گرامی نامہ میں لکھتے ہیں۔ "ایمان کی یہ کمزوری نہیں، بلکہ یہ طبعی احوال ہیں، جو بدلتے رہتے ہیں، طبعی احوال پر حکم نہیں لگایا جا سکتا، ایمان کا تعلق عقلی کیفیت سے ہے ......

یہ طبعی پریشانیاں تو پیش ہی آتی رہتی ہیں، اگر آج معاش کی پریشانی دور ہو گئی تو کل صحت و مرض اور تیسرے دن دوست و احباب وغیرہ کی خلش سے پریشانی ہوتی ہے، ان پریشانیوں سے بے ہمت نہ بنیں، رضا بالقضاء سے اس کا علاج کریں، اور ہمارے ہاتھ میں ہے ہی کیا ہے،

شاد باید زیستن ناشاد باید زیستن

پھر غم کیوں کیجئے، کیا انبیاء علیہم السلام اور اولیاء اس سے خالی تھے ...... دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو ظاہری و باطنی طمانیت بخشیں اور اپنا بنائیں"۔

ایک اور گرامی نامی میں ارقام فرماتے ہیں:

"مصیبت میں تو اور زیادہ حق تعالیٰ یاد آتے ہیں اور ان ہی کی یاد سے تسلی ہوتی ہے۔ کیونکہ ان کے سوا کوئی نہیں، جو اس مصیبت کو دور کر سکے"۔

حضرت والا رحمہ اللہ تعالیٰ نے اپنی اختیاری ہجرت[1] کے بعد 'صبر' کی گھاٹی کو جس خندہ پیشانی سے طے کیا وہ ان ہی کا حق اور رضا بالقضاء اور صبر و استقامت کا بہترین نمونہ تھا۔

شکر کی تعریف حضرت والا نے ان الفاظ میں فرمائی ہے:

"شکر یہ ہے کہ دل سے یہ سمجھنا کہ یہ نعمت اللہ تعالیٰ نے محض اپنے فضل و کرم سے استحقاق

[1] فرماتے تھے کہ لوگوں کی ہجرت اضطراری ہے اور میری اختیاری۔

کے بغیر عنایت فرمائی اور زبان سے الحمد للہ کہکر اس کا اقرار کرنا،

فرماتے تھے کہ "اِعْمَلُوْا آلَ دَاوٗدَ شُکْرًا" سے یہ مفہوم ہوتا ہے کہ عمل سے شکر ادا کیا جائے شکر مزید ترقیات کا زینہ ہے۔ متعدد خطوط میں اس طرح کے فقرے لکھتے تھے:

"ماشاء اللہ آپ کا حال اچھا ہے، شکر کیجئے، تو مزید بخشش ہوگی۔ بحکم وان شکرتم لازیدنکم"

"احوال قرین شکر ہیں، ان پر دل سے شکر ادا کیجئے کہ ترقی مزید ہو۔ ولئن شکرتم لازیدنکم"

ایک گرامی نامے میں تحریر فرماتے ہیں:

"آپ نے تحدیث نعمت کے طور پر جو حالات اپنے لکھے ہیں، وہ سب محمود ہیں، اور ان پر حق تعالیٰ کا جو محسن حقیقی ہیں، اکثر شکر ادا کیا کیجئے، ورنہ ذرا سا غرور و تکبر اپنے نفس کی طرف رکھنے سے سارا کیا کرایا خاک میں مل جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو ان شرور سے محفوظ رکھیں"۔

دوسرے والا نامہ میں ہے:

"دائم حضوری بھی انشاء اللہ تعالیٰ کبھی حاصل ہوگی، لیکن اس وقت بھی جو کچھ حاصل ہو جاتی ہے، شکریہ کے قابل ہے، شکر سے نعمت کی زیادتی ہوتی ہے"۔

احوال و مقامات | اس راہ میں سالک پر مختلف کیفیتیں اور حالتیں طاری ہوتی ہیں۔ یہاں تک کہ ملکۂ راسخہ حاصل ہو کر کسی خاص حال پر استقامت و دوام ہو جاتا ہے، اور سالک اسی پر قائم ہو جاتا ہے، اسے اصطلاحات میں مقام کہتے ہیں، احوال و کیفیات قابل توجہ نہیں ہوتے، مقامات قابل فکر و حصول ہوتے ہیں، مثلاً مقام تسلیم و رضا، صبر و شکر، توکل و تفویض، احسان و حضور وغیرہ،

حضرت رحمہ اللہ تعالیٰ ایک طالب کو تحریر فرماتے ہیں:

کیفیات احوال کبھی یکساں نہیں رہتے، یوں ہی بدلتے رہیں۔ سعدی کہتے ہیں:

بگفت احوال ما برق جہان است ۔۔۔ گہے پیدا و دیگر دم نہان است

اگر درویش بر حالے بماندے — سر دست از دو عالم بر فشاندے

ایک گرامی نامہ میں لکھتے ہیں:

"نماز میں کیفیات کے مختلف ہونے میں کچھ حرج نہیں، یہ احوال ہیں اور بدلتے رہتے ہیں، اللہ تعالیٰ ایک دن استقامت بھی عنایت فرما دیں گے، اسی کا نام مقام ہے۔"

دوسرے خطوط میں ہے کہ

"کیفیات و احوال کی طرف توجہ نہ کیجئے..... معمولات کی پابندی استقامت کی دلیل ہے۔"

"کیفیات آتی جاتی رہتی ہیں۔"

"یہ طبعی احوال ہیں، جو ادلتے بدلتے رہتے ہیں۔"

ایک طالب نے لکھا کہ آجکل بندہ پر ندامت اور افتادگی غالب ہے، شیخ نے جواب میں تحریر فرمایا:

"ہر حال کی طرح یہ حال بھی گو فانی ہے، تاہم متغیر ہے۔"

کسی نے لکھا "اپنی ذات سے گم ہو کر ذات متعال کو چھایا پاتا ہوں، اور اپنے کو دست ربی میں آلہ سمجھتا ہوں" حضرت والا نے جواب میں لکھا:

"ابھی یہ کیفیت ہے، انشاء اللہ تعالیٰ (اللہ تعالیٰ) مقام بھی عنایت فرمائیگا، کام میں لگے رہیے۔"

ایک طالب کو تحریر فرمایا:

"جی ہاں تسلیم و رضا کا یہی مقام ہے، خدا کرے کہ یہ حال آپ کا مقام بن جائے۔"

ایک مرتبہ یہ شعر

صوفی نشود صافی تا درنکشد جامے — بسیار سفر باید تا پختہ شود خامے

پڑھکر فرمایا "اس شعر میں سفر سے مراد حال ہے" یعنی استقامت و رسوخ سے پیشتر سالک کو بے شمار احوال کے تغیر سے گذرنا پڑتا ہے، تب جا کر استقامت و مقام نصیب ہوتا ہے" ایک طالب کو لکھتے ہیں:

"آپ کے معمولات اور احوال کو معلوم کر کے خوشی ہوئی، اسی طرح چلے چلیے

چلا چل تو منزل بمنزل یونہی — ٹھہرنے کی منزل ابھی دور ہے

احوال کا تغیر اور نشیب و فراز ہر سالک کو پیش آتا ہے، لیکن اس سے گھبرانا نہ چاہیے اور سعی جاری رکھنی چاہیے، بقول شیخ قدس سرہٗ

اضطراب آرام کا دیگا پیام — آج فردا کے لیے تمہید ہے

اے مسافر اور تھوڑی ہمت مردانہ کر — دیکھ لے وہ منزل مقصود دو سہ گام ہے

ایک خط میں تحریر فرماتے ہیں:

"یہ نشیب و فراز اور تلون عالم کی ہر چیز میں ہے، انسان بھی اسی عالم میں ہے، اس لیے اس سے گھبرانا نہ چاہیے، بلکہ اور زیادہ استقامت کے ساتھ اپنے کام میں مصروف رہنا چاہیے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ دعا اسی موقع کی ہے۔ اس کو پڑھا کیجئے "یا مقلب القلوب ثبت قلبی علی دینک"۔

دوسرے مکتوب میں ارشاد ہوتا ہے:

"بحمد اللہ کہ معمولات پورے ہوتے رہتے ہیں، تغیر و تبدل اور نشیب و فراز تو اس عالم کی ہر چیز میں ہے، یہ سب احوال محمود ہیں اور قابل شکر الٰہی، کام میں لگے رہیں، منزل مقصود تک تو رسائی انشاء اللہ ایک دن ہو ہی جائے گی۔"

ایک اور والا نامہ میں ہے

"حالات میں کوئی تغیر بجانب زوال بحمد اللہ کہ نہیں ہوا، یہی بہت بڑی نعمت ہے، باقی تغیر بجانب کمال تو وہ اسی استقامت طریق سے انشاء اللہ تعالیٰ حاصل ہوگا۔

کسی خاص مقام کے حصول کے بعد سالک کی سیر "سلوک ختم نہیں ہو جاتی کہ ہر مقام اپنے اندر قرب و اقربیت کے بے انتہا منازل رکھتا ہے۔

اے برادر بے نہایت درگہیست　　　　ہر کہ بروے می رسی بروے مایست

یہ شعر پڑھنے کے بعد ارشاد ہوا "علم و عمل کے جس مقام پر بھی پہنچ جائیں یوں سمجھیں کہ اب ابتدا ہو"۔

مولانا مسعود عالم صاحب ندوی مرحوم کو لکھتے ہیں:

"اب معلوم ہوا کہ احسان کا درجہ ایمان سے اونچا ہے اور اس کے بے انتہا مدارج ہیں، مدارج قرب و اقربیت کمالا تحفیٰ"۔

حصول مقامات اور رسوخ کے بعد استقامت و تمکین اور فن کے ساتھ مناسبت پیدا ہو جاتی ہے، اور اللہ تبارک و تعالیٰ کی رحمت سے یہ ظن غالب ہو جاتا ہے کہ اگر کوشش جاری رہی تو انشاء اللہ تعالیٰ سالک کو حسن خاتمہ، نجات اور رضا و قرب الٰہی نصیب ہو جائیگا، اس رسوخ تام کے بعد سالک کو اصطلاحاً کامل کہہ دیا جاتا ہے، جیسے معتد بہ حصول علم کے بعد فراغ و فضیلت کی سند دے دی جاتی ہے، لیکن اس کا منشا یہ نہیں ہوتا کہ فارغ و فاضل شخص علم کے اس انتہائی مدارج پر فائز ہو گیا ہے، جس کے بعد کمال کا کوئی درجہ نہیں، بلکہ مفہوم یہ ہوتا ہے کہ اگر اب یہ شخص خود کوشش کرتا رہے تو ایک دن علم و فضل کے اونچے مقامات پر بھی پہنچ جائیگا، درحقیقت عالم وہی ہے جو مرتے دم تک طالب علم رہے، اسی مثال سے سلوک میں کامل ہونے کے معنی سمجھ میں آسکتے ہیں، اس ظنی 'کمال' و 'رسوخ' پر عموماً تلقین و بیعت کی اجازت مرحمت فرما دی جاتی ہے، اور ان کاملین سے افاضۂ باطنی جاری ہو جاتا ہے، لیکن یہ کاملین حصول اجازت کے بعد اپنے لیے بے فکر نہیں ہو جاتے، بلکہ اس راہ میں مجاہدہ و کوشش آخری سانس تک جاری رہتی ہے، جو خوش نصیب آخر دم تک اپنے اعمال و احوال باطنی کی اصلاح میں مشغول، راہ حق پر مستقیم اور خوف و رجا کی کیفیت میں رہا، وہی حقیقت میں کامل ہے کہ اس عالم میں آخری سانس تک بھروسہ نہیں، بقول شیخ "آخری سانس جب تک نہ آئے وغدغہ جاری ہے"۔ ایک مرتبہ تحریر فرمایا:

یہ دگناہوں سے بچنے کی، کوشش آخر دم تک جاری رہے ورنہ شیطان تاک میں رہتا ہے،

اندریں رہ می تراش و می خراش　　　　تا دمے آخر دمے غافل مباش

ایک والا نامہ میں تحریر فرمایا:-

"اللہ تعالیٰ استقامت نصیب فرمائیں، لیکن ہر وقت اندیشہ لگا رہنا ایک نعمت ہے اسی سے خوف و رجا کی کیفیت پیدا ہوتی ہے، جو عین ایمان ہے"۔

غرض سالک صادق وہی ہے جو تکمیل و کمال کی فکر سے بے نیاز ہو کر حصولِ قرب و رضا کے لیے مرتے دم تک اعمال و عقائد، احوال و معمولات کی تحسین و تکمیل میں لگا رہے کہ عبدیت تامہ کا مجاہدہ موت سے پہلے ختم نہیں ہوتا، واعبد ربک حتی یاتیک الیقین، حضرت شیخ ارقام فرماتے ہیں:

'اصلاح کامل تو کسی زمانہ میں بھی نہیں ہو سکتی، کیونکہ جیسے جیسے کمال کی طرف آدمی بڑھتا ہے، اس کے نقائص اور زیادہ اس پر واضح ہو جاتے ہیں، مگر بندہ کو چاہیے اپنی کوشش میں لگا رہے"...... "جو کچھ اللہ تعالیٰ سے ملا، اس پر اس کا شکریہ ادا کیا جائے اور جو اب تک نہیں ملا، اس کی امید رکھنی چاہیے کہ اللہ تعالیٰ مناسب موقع پر اپنے فضل و کرم سے عنایت فرمائینگے"۔

ایک دوسرے مکتوب میں ہے:

"بے شبہ یہی بات ہے، ہمارے اعمال پوست ہی پوست ہیں، انسان جسقدر ترقی کرتا ہے، اپنے احوال و اعمال متوقع مراتب سے کم نظر آتے ہیں، اور یہی صحیح حال ہے"۔

پس معلوم ہوا کہ اس طریق کے ہر راہی کو ہر منزل پر یہی صدا آتی ہے

ابھی قطع کر اور راہِ طلب　　　　مقامِ محبت بہت دور ہے

بہر حال راہ سلوک عمر بھر کا روگ ہے، جو قلب مومن کو تمام روگوں سے شفا بخش دیتا ہے

اور بے روگ قلب ہی کل نجات پا سکیں گے۔ یوم لا ینفع مال ولا بنون الا من اتی اللہ بقلب سلیم، اس لیے یہ روگ روگ نہیں شفا ہے، اور اللہ تعالیٰ ہر مسلمان کو نصیب فرمائیں،

سلوک و معرفت میں حضرت سیدی رحمۃ اللہ علیہ کی فنی بصیرت اور تربیت سالکین کی مہارت کے مذکورۂ بالا چند شواہد پر اکتفا کیجاتی ہے، ورنہ سفینہ چاہیے اس بحر بیکراں کے لیے،

حضرت رحمۃ اللہ علیہ سلوک اور فن کو سمجھنے، دین کا صحیح فہم حاصل کرنے اور عمل کی ہمت پیدا کرنے کے لیے اپنے شیخ حضرت مجدد الملۃ حکیم الامت مولانا تھانوی رحمہ اللہ تعالیٰ کی کتابوں کے مطالعہ کی تلقین فرماتے تھے، خصوصاً ملفوظات و مواعظ کے متعلق تو انتہائی تاکید تھی کہ ان کا بغور مطالعہ کیا جائے اور حق یہ ہے کہ جس نے بھی ان مواعظ و ملفوظات کا مطالعہ کیا، ان سے متاثر ہوا، اور اس کی زندگی میں بحمد اللہ کچھ نہ کچھ مذہبی انقلاب ضرور پیدا ہو گیا، اسی لیے نگاہ سلیمانی میں ان کی اتنی قدر و قیمت تھی کہ میری پہلی حاضری کے وقت استفسار فرمایا "آپ نے مولانا تھانوی رحمہ اللہ تعالیٰ کے ملفوظات و مواعظ پڑھے ہیں"؟ راقم نے نفی میں جواب دیا تو فرمایا

"ملفوظات و مواعظ پڑھیے، وہاں ہر چیز اندر سے پھوٹ کر نکلی ہے"۔

متعلقین و منتسبین کو بکثرت ان کے مطالعہ کی تاکید فرماتے تھے، ایک صاحب سے جنھیں فقیر کے سامنے راولپنڈی میں بیعت کیا تھا، ارشاد فرمایا "کم از کم ساٹھ یا ستر مواعظ مطالعہ فرمالیجئے"۔

اس سلسلہ میں حضرت کے مکاتیب کے بعض اقتباسات نقل کیے جاتے ہیں جن سے ان مواعظ و ملفوظات کی اہمیت ظاہر ہوگی، شاید اس سے کسی طالب حق کو فائدہ پہنچے،

"مولانا تھانوی رحمہ اللہ تعالیٰ کے مواعظ و ملفوظات کا مطالعہ ضرور کیا کریں، بعید منافع اور علم صحیح اللہ تعالیٰ عنایت فرمائیں گے اور تمیز حق و باطل عطا ہوگی"۔

"ان کتابوں (ملفوظات و مواعظ اور انفاس عیسیٰ) کا بغور بغرض استفادہ مطالعہ

انشاء اللہ تعالیٰ مفید علم، محرکِ عمل اور مثمر برکات ہوگا"۔

"اگر آپ حضرت تھانویؒ کے مواعظ پڑھا کریں تو اس سے سب مرحلے طے ہوں گے"۔

"اگر کسی زندہ کی صحبت حاصل نہ ہو سکے تو حضرت تھانوی (رحمہ اللہ تعالیٰ) کے مواعظ اور ملفوظات دیکھا کریں، اور بری صحبت سے پرہیز کریں، انشاء اللہ تعالیٰ صحبت کے فوائد حاصل ہونگے"۔

"اگر آپ دین کا صحیح فہم حاصل کرنا چاہیں تو حضرت مولانا تھانوی رحمہ اللہ تعالیٰ کے ملفوظات اور مواعظ مطالعہ فرمائیں، اس کام میں مجھ سے جو امداد ہو سکے گی، انشاء اللہ تعالیٰ وہ ضرور ہوگی۔ بے جان نماز میں جان پڑ جائے گی انشاء اللہ تعالیٰ، پہلے آپ ان کتابوں کے مطالعہ سے دین کا صحیح فہم پیدا کریں"۔

"آپ مواعظ و ملفوظات تو ضرور ہی پڑھیں اور کوشش کر کے پڑھیں، ہمت اور کوشش کے بغیر دین کی راہ بھی طے نہیں ہو سکتی"۔

"اللہ تعالیٰ آپ کی حفاظت فرمائے، ملفوظات اور مواعظ سے جو ملے اس کو مطالعہ کریں، کم از کم چالیس پچاس وعظ پڑھ لیں"۔

"آپ حضرت مولانا تھانوی رحمہ اللہ تعالیٰ کی کتابوں میں سے پہلے قصد السبیل پھر تعلیم الدین پڑھیے، اور حضرت کے جسقدر مواعظ و ملفوظات مل سکیں۔ مطالعہ کرتے رہیں"۔

انفاس عیسیٰ کے متعلق ارشاد فرماتے تھے "یہ ہمارے مطب کا قرابادین ہے"۔ اور اس ناکارہ سے تو آخر میں فرمایا تھا کہ "اسے دیکھ کر اپنا علاج کیا کریں"۔

یہ چند اقتباسات اس محتاط قلم کے ہیں، جس کی علمی دیانت مسلمہ ہے، ان سے مواعظ و ملفوظات اشرفی کی افادیت کا اندازہ ہو سکتا ہے، اسی افادیت کی بنا پر حضرت والا رحمہ اللہ تعالیٰ کا خیال تھا کہ جدید تعلیم یافتہ طبقہ کے لیے نئے طرز سے ان مواعظ کو مرتب کیا جائے، کیونکہ مواعظ و ملفوظات طرز ادا

کی خوبی و دلپذیری کے لحاظ سے نئے طبقہ کے لیے بھی اتنے ہی نافع ہیں، جتنے پرانے طبقے کے لیے، ایک مرتبہ راقم سے فرمایا کہ کچھ مواعظ کی نئے طرز پر ترتیب کر کے بتایئے، تاکہ اگر پسند کے قابل ہوں تو اس طرح پر شائع کیے جائیں"، لیکن یہ ناکارہ اپنی کمزوری صحت اور دیگر مشاغل کی وجہ سے یہ خدمت بجا نہ لا سکا۔

ملفوظات سلیمانی — حضرۃ الشیخ قدس سرہٗ بہت کم سخن تھے لیکن جب بھی نطق سلیمانی گویا ہوتا علم و حکمت کے موتی بکھیرتا تھا۔ حضرت والا جامعیت علوم میں بے مثال تھے اور آپ کا سینہ انوار و حکمت ربانی کا خزینہ تھا، اس لیے جب بھی علم و حکمت کا یہ ربانی سوتا پھوٹتا تھا تو علوم و معارف کا ایک دریا موجزن ہو جاتا اور قلب و روح اور دل و دماغ کی کھیتیاں سیراب ہو جاتیں، شک و ریب، اضطراب و انکار کی تاریکی دور ہو جاتی تھی، اور ایمان و یقین کے نور سے سینہ روشن ہو جاتا، بقول شیخ

ایسے کچھ انداز سے تقریر کی — پھر نہ پیدا شبہۂ باطل ہوا
آج ہی پایا مزہ ایمان کا — جیسے قرآن آج ہی نازل ہوا
ادھر کہتا گیا وہ اور ادھر آتا گیا دل میں — اثر یہ ہو نہیں سکتا کبھی دعوائے باطل میں

جن خوش نصیبوں کو حضرت والا رحمۃ اللہ علیہ کی طویل صحبت نصیب ہوئی ہے، معلوم نہیں ان کے پاس خزینۂ سلیمانی کے کیسے کیسے لعل و گوہر موجود ہوں گے، اس دور افتادہ و درماندہ فقیر کا سرمایہ تو انتہائی قلیل ہے، اگرچہ عطیہ سلیمانی کا یہ ذرہ بھی اس مفلس بے مایہ کیلئے ہفت اقلیم کی دولت سے بڑھکر ہی، حضرت والا ملفوظات لکھا کرنا پسند نہیں کرتے تھے، ایک مرتبہ فقیر نے کچھ ارشادات مجلس میں لکھنے شروع کیے، تو یہ کہہ کر کہ "یہ کیا بہی کھاتے لے بیٹھے ہیں" منع فرمایا، مگر اس کے باوجود کچھ ملفوظات اس ناکارہ کے کمزور حافظہ میں محفوظ رہ گئے، کچھ مجلس سے اٹھنے کے بعد لکھ لیے تھے، لیکن وہ بہت قلیل ہیں، آخری حاضری (جولائی، اگست ۵۳ء) کے بعد جب حضرت کی باتوں سے صاف معلوم ہوتا تھا کہ علم و حکمت کا یہ گوہر شب چراغ چند دنوں کا مہمان ہے، خیال آیا کہ ملفوظات مبارک قلم بند کر کے حضرت والا سے ان پر نظر ثانی کرالی جائے، چنانچہ خدمت اقدس میں یہ معروضہ پیش کیا گیا، حضرت نے ۱۳ محرم الحرام ۷۳ھ

کے گرامی نامہ میں تحریر فرمایا:

"میرے ملفوظات کیا، بہرحال آپ بھیج دیں تاکہ دیکھ لوں"۔

لیکن تقدیر الٰہی میں نہ تھا کہ یہ جواہر پارے حضرت کی کیمیا اثر نظر سے گذرتے۔ حضرت شیخ کے ارشاد کے مطابق میں نے یہ ملفوظات قسط وار خطوط میں لکھکر بھیجنے شروع کیے، مگر اس وقت آپ کی آخری علالت کا سلسلہ شروع ہو گیا، اس لیے جواب سے محروم رہا، آخر میں عزیز مکرم سلمان میاں سلمہٗ کو حضرت والا کی خیریت دریافت کرنے کے لیے خط لکھا جس کا جواب حضرت شیخ نے اپنے قلم سے عنایت فرمایا، میرے نام حضرت والا کا یہ آخری مکتوب ہے، جو ۸ر نومبر ۱۹۵۳ء کو تحریر فرمایا گیا تھا، اپنی علالت کا تذکرہ اس میں صحت کے متعلق تحریر ہے۔

"الحمد للہ تعالیٰ ڈھائی ماہ کی علالت کے بعد افاقہ ہے، اصل مرض تو بہت حد تک زائل ہو چکا ہے، مگر ضعف غالب ہے، چلنے پھرنے کی ممانعت ہے، ابھی تک بیٹھکر نماز پڑھتا ہوں، آپ کے خطوط آئے تھے، جواب نہ جا سکا، سلمان میاں کو بھی دو روز سے بخار آ رہا ہے، اس لیے مجبوراً میں لکھ رہا ہوں، میری صحت کاملہ کے لیے دعا کیجئے"۔

اس کے بعد فقیر نے اس خیال سے کوئی عریضہ نہیں بھیجا کہ حضرت والا کو جواب میں تکلیف ہو گی، لیکن آہ کسے معلوم تھا کہ اس خط کو دو ہفتے بھی نہ گذرنے پائیں گے کہ اللہ تعالیٰ کا یہ محبوب بندہ اس کے حضور میں حاضر ہو جائے گا، اور جو لوگ اس کی صحت کاملہ کی امید کے سہارے جی رہے ہیں وہ ہمیشہ کے لیے اس سرمایۂ تسکین سے محروم ہو جائیں گے۔ مگر مرضی مولا از ہمہ اولیٰ

اے دل خموش صبر و رضا کا مقام ہے — نقش دوام فیض مٹایا نہ جائے گا

راقم نے جو چند ملفوظات قلمبند کیے ہیں، ان میں پوری دیانت سے یہ کوشش کی گئی ہے کہ الفاظ بھی حتی الامکان حضرت والا ہی کے ہوں، ورنہ کم از کم مفہوم تو ضرور ہی حضرت ہی کا ہو، بہرحال

اس گنج گراں مایہ کے کچھ لعل وگہر پیش ہیں:-

اس کی ابتدا ایک ایسے ملفوظ سے کیجاتی ہے جس سے سلوک سلیمانی کے کئی پہلوؤں پر روشنی پڑتی ہے، اور اس سے یہ بھی معلوم ہوگا کہ سینۂ اقدس فیضان نبوی سے کس قدر معمور تھا کہ ہر بات قرآن وحدیث کی عارفانہ تشریح ہے،

فرمایا: "میرا ایک شعر ہے:

کار فرما ایک آتا ہے نظر — منکشف اب رازِ الا اللہ ہے

اسے توحید افعالی کہتے ہیں، اس کے بغیر توحید کامل نہیں ہوتی، حاصل کرنے کی تو یہ چیز ہی کہ یہ اذعان ویقین پیدا ہوجائے کہ ہر چیز کے فاعل اللہ تعالیٰ ہیں، وہی مؤثر ہیں جو چیز بھی نظر آرہی ہے اس سے نگاہ ہٹ جائے، اور ہر چیز اللہ تبارک وتعالیٰ کی جانب سے ہوتی نظر آئے،

عرض کیا گیا، اس کے حصول کی کیا صورت ہے؟ فرمایا "پہلے اس عقیدہ کو معلوم کیجئے" عرض کیا گیا عقیدہ تو ہے، فرمایا "عقیدہ نہیں ہے، کیا آپ کو ہر چیز یونہی نظر آتی ہے، عقیدہ یہ ہے کہ اسباب پر سے اعتقاد اٹھ جائے، اور یہ یقین پیدا ہوجائے کہ ہر چیز کے کرنے والے اللہ تبارک وتعالیٰ ہی ہیں، اسباب میں تاثیر انہی کی ذات سے آرہی ہے، اسباب کے متعلق حضرت والا (مولانا تھانوی) رحمہ اللہ تعالیٰ کا ایک ملفوظ مجھ سے شعر میں ادا ہوگیا ہے،

یہ اسباب ہیں دستِ قدرت میں یوں — قلم دستِ کاتب میں جیسے رہے

اسباب کی حقیقت اس سے بڑھ کر کچھ نہیں، یہ تو بس ایک آلہ ہے، اس سے نگاہ اٹھ کر اللہ تعالیٰ کی ذات پر آجائے، یہ سب لا الٰہ الا اللہ میں شامل ہے، لا فاعل الا اللہ، لا مؤثر الا اللہ، لا معطی الا اللہ، لا مانع الا اللہ، لا ضار الا اللہ، لا نافع الا اللہ، لا خالق الا اللہ، لا رازق الا اللہ ..... یہ سب کچھ کرنے والے اللہ تعالیٰ ہیں۔

کیا مخلوق کو مؤثر یا کرنے والا سمجھنا شرک نہیں؟ ہر نبی کو کسی خاص صفت میں خصوصی کمال حاصل تھا، حضرت یعقوب علیہ السلام تدبیر وتوکل کے جامع تھے، قرآن کریم میں ہے کہ جب یعقوب علیہ السلام کے بیٹے مصر جانے لگے تو آپ نے ان سے ارشاد فرمایا

یٰبَنِیَّ لَا تَدْخُلُوْا مِنْ بَابٍ وَّاحِدٍ — اے میرے بیٹو سب کے سب ایک ہی دروازے

وَّادْخُلُوْا مِنْ اَبْوَابٍ مُّتَفَرِّقَةٍ — سے مت جانا مختلف دروازوں سے داخل ہونا

وَمَآ اُغْنِیْ عَنْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ مِنْ شَیْءٍ — اور میں خدا کے حکم کو تم پر سے نہیں ٹال سکتا،

اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ عَلَیْهِ تَوَكَّلْتُ — حکم تو بس اللہ ہی کا چلتا ہے (باوجود اس تدبیر ظاہری

وَعَلَیْهِ فَلْیَتَوَكَّلِ الْمُتَوَكِّلُوْنَ — کے دل سے) اسی پر بھروسہ رکھتا ہوں اور اسی پر

(اور اسی پر بھروسہ کرنا چاہیے بھروسہ کرنے والوں کو)

اس سے حضرت یعقوب علیہ السلام کی تدبیر وتوکل کی جامعیت معلوم ہوتی ہے، ظاہر میں اسباب اختیار کرنے کا حکم دیا، لیکن باطن میں ان اسباب پر کچھ بھروسہ نہ تھا، بلکہ یہ یقین راسخ تھا کہ حقیقت میں تو وہی ہوگا جو اللہ تبارک وتعالیٰ چاہیں گے، اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ یہ وہ علم تھا جو ہم نے یعقوب علیہ السلام کو مرحمت فرمایا تھا، اسباب کے ہوتے ہوئے اسباب پر نگاہ نہ ہونا اللہ تعالیٰ کے فضل سے ہی میسر آتا ہے ؎

در کفِ جام شریعت در کفِ سندانِ عشق — ہر ہوسناکے نداند جام وسنداں باختن

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی توحید سب سے کامل تھی، ان کی زبان سے اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں یہ ارشاد فرمایا ہے:-

..... فَاِنَّهُمْ عَدُوٌّ لِّیْٓ اِلَّا رَبَّ الْعٰلَمِیْنَ — وہ (بت) میرے دشمن ہیں، مگر تمام عالم کا پروردگار جس نے

الَّذِیْ خَلَقَنِیْ فَهُوَ یَهْدِیْنِ، وَ — مجھے پیدا کیا وہی مجھے ہدایت دے گا وہی ہے جو

الَّذِیْ هُوَ یُطْعِمُنِیْ وَیَسْقِیْنِ — مجھے کھلاتا ہے اور پلاتا ہے، اور میں جب بیمار پڑتا ہوں تو شفا دیتا ہے، وہی مجھے مارے گا اور

واذا مرضت فھو یشفین والذی — اور پھر زندہ کرے گا اور وہی ذات ہے جس سے
یمیتنی ثم یحیین والذی اطمع — میں امید رکھتا ہوں کہ قیامت کے دن میرے
ان یغفرلی خطیئتی یوم الدین — گناہوں کو معاف کر دے گا۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ابراہیم علیہ السلام جو ہر قسم کے شرک سے پاک تھے، ان کی توحید افعالی تھی، پس اسکے حاصل کرنے کی کوشش کرنی چاہیے کہ بغیر اس کے توحید کامل نہیں ہوتی، عرض کیا گیا کہ اسباب کو ترک کر دیا جائے، فرمایا "اسباب دو قسم کے ہیں، اسباب حقیقی و اسباب ظنی، اسباب حقیقی کا ترک جائز نہیں کہ اس کے فاعل تو اللہ تعالیٰ ہیں، جیسے کھانا کھانے سے اللہ تعالیٰ نے بھوک رفع کرتے ہیں، اولاد بیوی کے پاس جانے سے پیدا ہوتی ہے، اور ظنی جیسے سفارش کرنا وغیرہ ہیں، انھیں ترک کیا جا سکتا ہے، ہر حال فاعل اور مؤثر حقیقی اللہ تبارک و تعالیٰ کو جانیں....."

"اللہ تعالیٰ اس ذات کا نام ہے جو تمام صفات حسنہ کی جامع ہے۔ 'اللہ' کہتے ہوئے اللہ تعالیٰ کا دھیان اس کی تمام صفات حسنہ کے ساتھ ہونا چاہیے، وہ نافع بھی ہیں، ضار بھی ہیں، معطی بھی ہیں، مانع بھی، خالق بھی وہی ہیں رازق بھی وہی ہیں۔ اللہ کہتے ہوئے ان کی تمام صفات کا استحضار ہونا چاہیے، غالباً مولانا روم نے مثال کے طور پر بتایا ہے کہ جس طرح سو کے عدد میں ایک، دو، تین کے عدد شامل ہوتے ہیں، اسی طرح اللہ کی ذات میں تمام صفات حسنہ جمع ہیں، جب انسان 'اللہ' کہے تو یقین ہو کر لا خالق الا اللہ، لا مالک الا اللہ، لا قادر الا اللہ، لا فاعل الا اللہ، لا مؤثر الا اللہ، لا سمیع الا اللہ، لا بصیر الا اللہ، لا رازق الا اللہ، لا معطی الا اللہ، لا مانع الا اللہ، لا نافع الا اللہ، لا ضار الا اللہ..... اللہ تبارک و تعالیٰ کے سوا ہر چیز سے ان صفات کی نفی ہو، اور اللہ ہی میں تمام صفات کو سمجھا جائے۔"

اس مقام پر راقم نے عرض کیا حضرت والا کا ایک شعر ہے

اب مسئلہ کثرت و وحدت کو میں سمجھا — پا کر تجھے سب تیرے سوا بھول گیا ہوں

کیا اس شعر سے وہی مفہوم مراد ہے جسے عام صوفیہ لا موجود الا اللہ کے لفظوں میں ادا کرتے ہیں، ارشاد فرمایا "محبت کی وجہ سے عاشق کو سوا محبوب کے کچھ نظر نہیں آتا، اور ہر چیز میں وہی دکھائی دیتا ہے، یہاں بھی یہی چیز مراد ہے، ہر چیز کو خدا سمجھنا تو وحدۃ الوجود نہیں، یہ تو وحدت کو کثرت قرار دے لینا ہے، اللہ تبارک و تعالیٰ کے سوا کسی کا نظر میں نہ آنا یہ وحدۃ الوجود ہے، لا موجود الا اللہ کہنے سے کیا بنتا ہے، موجودات ہوں تو کیا، نہ ہوں تو کیا، اپنے کو موجودات سے خارج تو نہیں کرتا، اصل شے تو اپنے دل سے اللہ تعالیٰ کے غیر اور ماسوا کو خارج کرنا اور اسکی محبت بسانا ہے، ہمارے حاجی[1] صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے، لا الٰہ الا اللہ کہتے ہوئے یوں سمجھے کہ ماسوا کی محبتوں کو قلب سے خارج کر رہا ہوں، اور اللہ تعالیٰ کی محبت دل میں داخل کر رہا ہوں، جب دل میں اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی نہ ہو تو پھر ساز و سامان، تاج و تخت وغیرہ تمام دنیا موجود ہو تو کچھ ضرر نہیں، اللہ تبارک و تعالیٰ تخت و سامان میں بھی حاصل ہو سکتے ہیں اور اگر دل میں غیر اللہ سمایا ہو، ماسوا کی محبت ہو، تو ایک کملی بھی نقصان دے سکتی ہے، میں نے بزرگوں سے سنا ہے کہ ایک کملی پوش شخص شیخ کی تلاش میں تھے، جہاں جاتے شیوخ میں کچھ ایسی چیز پاتے جو ان کی دانست میں کمال کے منافی ہوتی تھی، ایک بزرگ کے پاس پہنچے، وہاں چاندی سونا اور دوسرے نہایت قیمتی سامان پائے، دل میں کہا، یہ کیسا درویش ہے کہ اتنی دنیا اکٹھا کر رکھی ہے، شیخ نماز میں تھے، اس شخص کے خطرہ پر انھیں نماز میں وقوف ہوا، نماز کے بعد فرمایا، آؤ! حج کے لیے چلیں، وہ شخص بھی تیار ہو گیا اور شیخ اپنا کل سامان چھوڑ کر اسی وقت سفر پر روانہ ہو گئے، کچھ راستہ طے کیا تھا کہ وہی شخص کہنے لگا، حضرت ٹھہریے، میں اپنی کملی بھول آیا ہوں، اسے لیتا آؤں، شیخ نے ارشاد فرمایا تم اپنی ایک کملی کو نہ چھوڑ سکے، اور ہم اپنا سارا مال و متاع یوں ہی چھوڑ آئے،

---

[1] حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ

اور اس کا احساس تک نہ ہوا۔ پھر شیخ نے فرمایا

ما ایں ذرہ درنگی انداختہ ایم نہ در دل

ہمارے حضرت والا رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا، اگر کملی میں دل اٹک رہا ہو تو وہ بھی مانع ہے، اور تخت میں دل نہ الجھا ہو تو وہ مانع نہیں، مولانا روم نے فرمایا ہے،

ہم خدا خواہی و ہم دنیائے دوں　　　　ایں خیال است و محال است و جنوں

عام طور سے اس کا مطلب یہ لیا جاتا ہے کہ دنیاوی مال و متاع کے ساتھ اللہ تعالیٰ نہیں مل سکتے، مگر مولانا نے دنیا کا جو مطلب لیا ہے وہ اس سے اگلے شعر میں بیان فرمایا ہے

چیست دنیا از خدا غافل شدن　　　　نہ قماش و نقرہ و فرزند و زن

یہاں دنیا سے مراد خدا سے غافل ہونا ہے، قماش و نقرہ و فرزند و زن دنیا نہیں، اگر وہ اللہ تعالیٰ سے غافل کرانے والے نہ ہوں، ہمارا ریاض یہ نہیں کہ بارہ سال جنگل میں بھوکا رہا جائے، یا الٹا لٹک کر عبادت کیجئے۔ احقر نے عرض کیا مگر صلوٰۃ معکوس پڑھتے ہیں، فرمایا صلوٰۃ معکوس نہیں تصوف معکوس ہے، یہ چیزیں جوگیوں سے لی ہیں، اور تصوف کا ناس کر دیا ہے، ہمارا ریاض یہ ہے کہ باطن میں اللہ تعالیٰ کی محبت ہو، دل سے غیر کی محبتیں خارج ہو کر اللہ تعالیٰ کی محبت آچکی ہو، اور ظاہر میں اعمال صالح کی ہر حالت میں پابندی ہو، محبت کا یہ مطلب نہیں کہ نام لے تو رونا آجائے، بلکہ محبت کا مطلب یہ ہے کہ جتنی محبت بڑھتی جائے۔ اتنا ہی اتباع نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں کامل ہوتا جائے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی محبت کی یہی پہچان بتائی ہے۔ اِنْ کُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰہَ فَاتَّبِعُوْنِیْ یُحْبِبْکُمُ اللّٰہُ ۔ لوگ سمجھتے ہیں کہ اتباع نبوی میں صرف ظاہری اتباع کافی ہے۔ سیاہ پگڑی باندھ لی، سرمہ لگا لیا، تہبند نصف ساقین تک اونچا کر لیا اور اتباع مکمل ہو گیا، ظاہری اتباع کی نفی نہیں کرتا، وہ بھی ضروری ہے، لیکن باطنی اتباع اس سے بھی زیادہ ضروری ہے

احوال میں اتباع ہو، فکر و کیفیات قلبی میں اتباع ہو، اس کی طرف توجہ نہیں جاتی، صابرین فی الباساء والضراء وحین الباس، ہر حال میں سختی میں، لڑائی میں، بیماری میں، لڑائی کے وقت، غرض ہر حالت میں اور ہر وقت اپنی خواہشات کو روک کر اللہ تعالیٰ کے احکام کے مطابق عمل کرنا اپنا ریاض ہے، ضابط نفس ہو، اللہ تعالیٰ کے اوامر کا ہر حال میں پابند ہو، یہی اصلی مقصد اور یہی تصوف ہے، آنکھیں بند کر کے سبز و زرد نور دیکھنا یا کچھ نظر آنا یہ تو کچھ بھی نہیں، اگرچہ حضرت حاجی رحمۃ اللہ علیہ نے ان کا تذکرہ کیا ہے، مگر اس کی حیثیت ایسی ہی ہے جیسے بچوں کو کھلایا اور بہلایا جاتا ہے۔ اور بادلوں کو دکھا کر کہا جاتا ہے کہ وہ دیکھو ہاتھی لڑ رہے ہیں، لیکن ہاتھیوں کا کوئی وجود نہیں ہوتا، اسی طرح یہ بچوں کے بہلانے کی چیزیں ہیں، مولانا عیسیٰ خلیفہ مجاز حضرت مولانا تھانوی رحمہ اللہ تعالیٰ سے ایک شخص نے شکایت کی کہ اب کچھ نظر نہیں آتا۔ فرمایا تمہارے بلی جو ہے نظر نہیں آتے، حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے، وجود ظلمانی سے وجود نورانی زیادہ خطرناک ہے، اسے مقصد سمجھ لیا جاتا ہے، اور ان ہی قصوں اور بھول بھلیوں میں سالک اٹک کر رہ جاتا ہے، بات یہ ہے کہ کیفیات، کشف و انوار کو مقصد سمجھ لیا جاتا ہے حالانکہ یہ سب کچھ (اکثر) اپنے دماغ کی پیداوار ہوتی ہے، آنکھیں بند کر لیں اور کچھ دماغی اوہام نظر آنے لگے، اور سمجھ لیا کہ اللہ سبحانہ و تعالیٰ کا نور دیکھ رہے ہیں، جس طرح عام لوگوں کے وساوس اور اوہام ہوتے ہیں اسی طرح یہ بزرگانہ اوہام ہیں، شیخ نقشبند رحمۃ اللہ علیہ کا جن کی طرف نقشبندی سلسلہ منسوب ہے، ارشاد ہے کہ

"ہر چہ دیدہ یا شنیدہ می شود غیر خدا است" ؎

اے برتر از خیال و گمان و قیاس و وہم　　　　وز ہر چہ گفتہ اند شنیدیم و خواندہ ایم

میرا ایک شعر ہے:

آتے ہو تصور میں بھر بھر کے نئے روپ　　ان سب سے پرے سمجھیں تم کو تو یہ ایمان ہے

وہ تو ہر چیز سے وراء الوراء ہیں،

ہمارا ریاض تو بس یہی ہے کہ سونے چاندی، زر و جواہر کے ڈھیر و تھیلیاں پڑی ہوں اور ادھر نگاہ تک نہ ڈالی جائے، کمال حسن و جمال موجود ہو، تنہائی ہو، قدرت ہو، لیکن ادھر اللہ تعالیٰ کے تعلق کی بنا پر قطعاً توجہ نہ کیجائے، یہ کیا ہے کہ بارہ سال جنگل میں روٹی نہیں کھائی، الٹے لٹکے رہے، یہ تو جوگی بھی کر لیتے ہیں۔"

اس ملفوظ سے حضرت سید الملة رحمۃ اللہ علیہ کے تصوف پر پوری روشنی پڑتی ہے کہ تصوف و سلوک حقیقت میں شریعت کے کمال اتباع اور کتاب و سنت کی کامل پیروی کا نام ہے، ان ہی دونوں چیزوں کے باہر تصوف کا کوئی وجود نہیں، اور جس طرح شریعت کی ظاہری پابندی ضروری ہے، اسی طرح بلکہ اس سے بڑھکر باطنی پابندی لازمی ہے، حضرت شیخؒ کا ایک شعر ہے

اب تو مے نوشی ہو عین شرع بر فتوائے شیخ　　اب وہی ہو گا فقیہ شہر جو مے نوش ہے

سلوک سلیمانیؒ کی اس تشریح کے بعد ان حضرات کا اعتراض خود بخود اٹھ جاتا ہے جو حضرت والا رحمہ اللہ تعالیٰ کے طریق و سلوک کی طرف رجوع کرنے پر اعتراض کرتے ہیں کہ جس کسی کو بھی اپنی نجات کی فکر، اللہ تعالیٰ کی رضا کی طلب اور اپنی اصلاح کا خیال اور قیامت کے محاسبہ کا خوف ہو گا وہ ضرور اپنی باطنی اصلاح کی جانب توجہ کرے گا کہ اس کے بغیر دین کامل کا حصول ممکن نہیں،

دستار فضیلت ہو یا دلق مرقع ہو　　ہو جاتا ہے اک دن نذر مے و میخانہ

اللہ تبارک و تعالیٰ ہمیں اور سب مسلمانوں کو اپنی رضا و قرب کے اس طریق پر گامزن رکھے، اور کامل ایمان پر خاتمہ فرمائے۔

آخر میں اہل نظر حضرات خصوصاً مولانا عبد الباری صاحب ندوی اور مولانا عبد الماجد صاحب دریابادی

کی خدمت میں التماس ہے کہ میری تعبیرات میں اور تحریر میں اگر کوئی بات مسلک شیخؒ کے خلاف نظر آئے تو آگاہ فرما کر اس غلطی کا ازالہ فرمایا جائے کہ اس نااہل کی کج فہمی و بے علمی کی بنا پر حضرت والا رحمہ اللہ تعالیٰ کی ذات گرامی کی طرف کوئی غلط بات منسوب نہ ہو جائے، راقم نے یہ مضمون اصل میں سلیمان نمبر کے لیے ستمبر ۵۴ء میں لکھا تھا، پھر اس خیال سے نہیں بھیجا گیا کہ ممکن ہے اس موضوع پر کسی اور بزرگ نے لکھا ہو، لیکن پھر سلیمان نمبر کے دیکھنے کے بعد حضرت والاؒ کے علوم کی اشاعت کے خیال سے اس کو اشاعت کیلئے بھیجدیا گیا، میرا ماخذ زیادہ تر چھ سات حضرات کے نام حضرتؒ کے مکاتیب اور باقی حضرت والا قدس سرہٗ کے وہ ملفوظات ہیں جو اس احقر نے سنے، مکاتیب کی نقل میں غلطی کا امکان نہیں ہے، ہاں ملفوظات کی نقل میں تغیر کا اندیشہ ہو سکتا ہے، مگر جہاں تک ہو سکا ہے حضرتؒ کے الفاظ کی پابندی ورنہ کم از کم ان کے صحیح مفہوم کو بیان کرنے کی کوشش کی گئی ہے، گو یہ ناکارہ اس قابل نہیں کہ حضرت سید الملة جیسے امام فن اور محقق شیخ کے سلوک و تصوف پر قلم اٹھاتا، لیکن مولانا مسعود عالم ندوی مرحوم و مغفور کی ایک انتہائی محبت میں ڈوبی ہوئی تحریر نے ان صفحات کے لکھنے پر مجبور کر دیا، اللہ تعالیٰ میری غلطیوں کو معاف فرمائے، اور حضرت والا قدس سرہٗ کے فیوض و برکات سے آخر دم تک مستفید فرمادے۔

سلیمان نمبر

معارف کا سلیمان نمبر جسکا شائقین و قدردان معارف کو مدت سے انتظار تھا ہی میں شائع ہو گیا، اسمیں مولانا سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ کے سیر و سوانح، اخلاق و شمائل، فضائل و کمالات، اور انکے علمی و دینی، قومی و ملی، اصلاحی و تعلیمی کارناموں اور خدمات کا پورا مرقع آگیا ہے، پہلے سیر و سوانح کا حصہ ہے، پھر عمومی حیثیت کے مضامین اور مقالات ہیں، اسکے بعد مرحوم کے سلوک و تصوف پر روشنی ڈالی گئی ہے، آخر میں متعدد منظومات اور قطعات تاریخ ہیں، یہ نمبر معارف کے مستقل خریداروں کو ۸ر میں اور عام خریداروں کو علاوہ محصول ڈاک کے للعہ میں دیا جاتا ہے۔

منیجر

عہدِ جہانگیری کا ایک اہم مصنف و شاعر

یعنی

تقی اوحدی اصفہانی صاحب عرفات العاشقین

از جناب ڈاکٹر نذیر احمد صاحب لکھنؤ یونیورسٹی

تقی اوحدی[1] دسویں اور گیارہویں صدی کا ایک اہم مصنف ہے، جس نے فارسی نظم و نثر میں اپنے کمال کی بہت سی یادگاریں چھوڑیں، مگر بدقسمتی سے اس کی ساری تصنیفات دستبرد زمانہ کی نذر ہوگئیں، صرف ایک تذکرہ عرفات العاشقین باقی رہ گیا ہے، اور وہ بھی اس حد تک نادر و نایاب ہے کہ اس کے صرف ایک نسخے کا ابتک پتہ چل سکا ہے، مگر یہ تذکرہ اتنا اہم ہے کہ اسے فارسی ادب میں سنگ میل کی حیثیت حاصل ہے، اور محض اسی کتاب کی بدولت تقی کا نام مدتوں روشن رہیگا، اس تذکرہ کی اہمیت کے پیش نظر مصنف کے حالات و واقعات کو یکجا کر دیا گیا ہے۔

نسب خاندان تقی اوحدی ایران کے ایک مشہور خاندان سادات کا فرد تھا، اس خاندان نے اوحد الدین[2] عبد اللہ

[1] اسی زمانہ میں تقی الدین نام کا ایک اور اہم تذکرہ نویس گزرا ہے جو کاشان کا رہنے والا تھا، اور جس کا خلاصۃ الاشعار فارسی شعراء کا بے مثل تذکرہ ہے، راقم نے اس کا تعارف معارف بابت ماہ نومبر ۱۹۵۳ء میں کرایا ہے۔

[2] تقی اوحدی خود لکھتا ہے: بداں کہ حسب نسبت این شکستہ از حسب سالی من قبل الآبا بہفت واسطہ بہ شیخ المشائخ غوث الزمان امیر شیخ اوحد الدین عبد اللہ بن ضیاء الدین مسعود الفارسی البلیانی می رسد و از د ..... بجند صلب و بطن بہ شیخ المحققین قطب المتقین شیخ ابو علی دقاق و از وے بجند واسطہ بہ امام موسیٰ کاظم علیہ السلام۔

اور ابو علی[1] دقاق جیسے مشائخ روزگار پیدا کیے، وہ حسینی سید اور اوحد الدین کی ساتویں پشت میں تھا، جن کا سلسلۂ نسب[2] ابو علی دقاق سے اس طرح ملتا ہے:

اوحد الدین عبد اللہ بن مسعود بن محمد بن علی بن احمد بن عمر بن اسمٰعیل بن ابو علی دقاق۔ ان کی طرف سے بھی تقی اوحدی کی سیادت مسلم تھی، اس کے نانا حافظ سعد الدین[3] عنایت اللہ خوانساری ولایت کی دولت کے مالک تھے، ان کا سلسلۂ نسب زین الاولیا، خواجہ حسن ماشی[4] تک پہنچتا ہے، اس طرح مادری اور جدی دونوں سلسلوں میں ولایت کا سلسلہ چلا آتا تھا، چنانچہ تقی نے اسکی طرف کئی بار اشارہ کیا ہے، مثلاً[5]:

وایں کمینہ ذرہ را از طرفین آبا واجداد کامل فاضل، موحد، صاحب خرقہ و سجادہ بل ہادی و مہدی زمان و دوران بودہ اند ..... از نشاء آدم شراب معارف جاودانی چوں جام و دستکامی دریں سلسلہ الی یومنا ہذا دست بدست آمدہ۔

باپ کے حالات[6] کے ضمن میں لکھتا ہے:

بطناً بعد بطن صاحب خرقہ و سلسلۂ اولیا، و اصفیا شدہ اند

تقی اوحدی کی دو نسبتیں یعنی اوحدی و دقاقی اس کے دو بزرگوں یعنی اوحد الدین اور ابو علی دقاق سے علی الترتیب متعلق ہیں، اس خاندان میں یہ دو بزرگ سب سے زیادہ نمایاں تھے اور

[1] ابو علی دقاق کے حالات کے لیے ملاحظہ ہو کشف المحجوب (ترجمہ اردو) ص ۱۰۱ و نفحات الانس ص ۲۴۳

[2] ملاحظہ ہو نفحات الانس ص ۲۴۳۔ جہاں اوحد الدین کا سنہ وفات ۶۸۶ھ اور ۵ عارفانہ شعر اور ایک عاشقانہ رباعی دی ہے۔

[3] یہ ان کا لقب معلوم ہوتا ہے کیونکہ دوسری جگہ صرف عنایت اللہ ملتا ہے، عجیب سی بات یہ ہے کہ یہی تقی کے دادا کا بھی نام تھا۔

[4] یہ لفظ مشکوک ہے، دیباچے میں خوانسپا پوری اور دوسری جگہ خوانساری ملتا ہے، (تصحیح قیاسی)

[5] دیباچۂ عرفات میں، انکا مضجع بحر آباد قان کے قریب لکھا ہے [6] دیباچۂ عرفات [7] عرفات ورق ۱۷۱

اس لحاظ سے تقی کی کوئی خاص حیثیت نہیں ہے، مگر ادیب و شاعر کے اعتبار سے وہ اس خانوادہ میں سب سے نمایاں نظر آتا ہے۔

وطن و مولد | تقی کا نام پانچ نسبتوں سے ملتا ہے: اوحدی، دقاقی، حسینی، بلیانی، اصفہانی۔ ان میں پہلی دو کا تعلق آبائی ہے، تیسری سے حسینی سید ہونا ظاہر ہوتا ہے، چوتھی اور پانچویں اس کے وطن اور مولد کا علی الترتیب پتہ دیتی ہیں، بلیان کے متعلق وہ خود لکھتا ہے:

اما بلیان کہ موطن آبائے عظام این کمینہ و مدفن شیوخ کرام این سلسلہ است قریۂ از اعمال[1] گازرون فارس است مبنی بر بقعات آبائے این ذرہ۔

بلیان کے بجائے بعض جگہ بلبان بھی ملتا ہے، عرفات العاشقین کے دیباچے میں دوبار اور متن[2] میں ایک جگہ بلیان اور بلیانی ہی ہے، لیکن بانکی پور کے کیٹلاگر[3] نے تین چار مرتبہ تقی کی نسبت بلبانی لکھی ہے، حالانکہ اس کے پیش نظر عرفات کا وہی نسخہ تھا جس کو میں نے دیکھا ہے۔ البتہ اسپرنگر نے دوجگہ[4] اوحد الدین عبد اللہ کی وطنی نسبت بلیانی درج کی ہے، نفحات الانس[5] کے مطبوعہ نسخے میں یہ نسبت "ی" ہی سے ملتی ہے، مگر ریاض الشعرا[6]، صحف ابراہیم[7]، اور صبح گلشن[8] میں بلبان اور بلبانی "با" سے ہے، چونکہ عرفات میں بلاشبہ بلیان اور بلیانی ہے جس کی تائید نفحات سے بھی ہوتی ہے، اس لیے بلبانی کو مشکوک قرار دینے میں ہم حق بجانب ہوں گے۔

بہرحال تقی کے اجداد کا تعلق بلیان سے تھا، جو گازرون کے علاقہ میں ہے، اور یہ گازرون فارس میں ہے، اس سلسلہ میں اس کے آباؤ اجداد نے شیراز میں بھی سکونت اختیار کرلی تھی، تقی نے

[1] دیباچۂ عرفات [2] ورق ۱۰۲، ۱ [3] فہرست مخطوطات جلد ۸ (مخطوطات فارسی) مرتبہ مولوی عبدالمقتدر ص ۱۱
[4] اورینٹل کیٹلاگ ص ۵۵ حاشیہ، مگر اس نے بائے (دال) مفتوح اور مضموم دونوں سے لکھا ہے [5] ص ۲۴۳
[6] نسخۂ خطی (لکھنؤ یونیورسٹی) [7] نسخۂ خطی (نادر آغاز) ص ۲۸۸ [8] ص ۸۸

عرفات میں صاف طور پر یہ اطلاع بہم پہنچائی ہے[1]

در عنفوان حال .... از اصفہان کہ مولد و موطن اصلیت بود متوجہ شیراز شدم کہ منزل آبا و اجداد بود۔

اس سے یہ بات بھی ثابت ہوتی ہے کہ تقی کی پیدائش اصفہان میں ہوئی اور وہ اسے اپنا اصلی وطن سمجھتا تھا، اور جیسا کہ آیندہ معلوم ہوگا تقی کی زندگی کا بیشتر حصہ اصفہان ہی میں گزرا، اس لیے وہ اسے اصلی وطن قرار دینے میں حق بجانب تھا، ورنہ اس کے اجداد فارس سے تعلق رکھتے تھے، اور بلیان ہی اس کا آبائی وطن قرار پائے گا۔

والد | تقی کے والد کا نام معین الدین تھا، چنانچہ دیباچے میں والد کا نام معین الدین محمد اور دادا کا نام سعد الدین محمد دیا ہے[2]، مگر متن میں جہاں والد کا تذکرہ کیا ہے وہاں ان کا نام اس طرح ملتا ہے:

شیخ معین الدین بن محمد بن شیخ سعد الدین بن محمد الاوحدی الحسینی البلیانی الدقاقی

اس اختلاف کی بظاہر کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی، اس لیے بجز اس کے کہ ہم معین الدین اور سعد الدین کے بعد کے "بن" کو کتابت کی غلطی قرار دیں اور کوئی صورت نہیں ہے، اس نسبت سے یہ بات بھی واضح ہوجاتی ہے کہ تقی کے خاندان کا ہر فرد اپنے نام کے ساتھ اوحدی، حسینی، بلیانی اور دقاقی ملحق کرتا تھا، اور یہ نسبتیں کچھ تقی ہی کے لیے مخصوص نہ تھیں،

شیخ معین الدین[3] کی پیدائش ۹۴۱ھ میں ہوئی، بارہ سال کی عمر سے شیراز کی ایک مسجد میں جو بعد میں ان ہی کے نام سے مخصوص ہوگئی، خطبہ و امامت کا فرض انجام دیتے تھے، گویا کمسنی ہی میں اپنے زہد و اتقا کا سکہ لوگوں کے دلوں میں بٹھا چکے تھے، اور اس طرح اپنی خاندانی

[1] ورق ۵۰۲ ذیل حالات عرفی [2] ورق ۱۰۲، ۱ [3] ایضاً

روایت کو قائم رکھا تھا، ۹۷۱ھ میں جب وہ اپنی عمر کی تیس منزلیں طے کر چکے تو قزوین گئے، اور شاہ طہماسپ صفوی (متوفی ۹۸۴ھ) کے دربار میں رسائی حاصل کی، بادشاہ نے ان کی بڑی قدر کی اور خلعت و فرمان عطا کیا، وہاں ایک سال رہے، پھر اصفہان آئے[1] اور حافظ عزّ الدین کی لڑکی سے نکاح کیا، حافظ مذکور اصفہان کی جامع مسجد کے امام اور بڑے پائے کے بزرگ تھے، ابھی تقی اوحدی شکم مادر ہی میں تھے[2] کہ ان کے والد بعض ضرورتوں[3] سے مجبور ہو کر اصفہان سے شیراز چلے آئے، یہاں بھی ان کو زیادہ دنوں قیام نصیب نہ ہوا، کئی جگہ کا سفر[4] درپیش تھا، مگر بالآخر ہندوستان کی طرف چل نکلے،[5] اور یہاں پہنچکر جام اجل نوش کیا، وہ کبھی کبھی اچھے شعر بھی کہتے تھے، بڑی فضیلت کے مالک تھے، تقی کے الفاظ یہ ہیں:

الحق کمال استعداد و قابلیت ذاتی و کسبی داشتہ

پیدائش اور ابتدائی تعلیم و تربیت تقی اصفہانی کو بعض تذکرہ نویسوں[6] نے تقی الدین محمد لکھا ہے، مگر عرفات[7] میں خود مولف نے اپنا نام صرف تقی لکھا ہے، اور اسپرنگر[8] اور عبد المقتدر[9] دونوں نے عرفات ہی کی پیروی میں "تقی" ہی لکھا ہے، بعض تذکروں[10] میں بھی یہی مختصر نام ملتا ہے، چونکہ اسکے باپ اور دادا کے نام میں بھی "الدین" اور "محمد" تھا، اس لیے تعجب نہیں کہ تقی کا پورا نام تقی الدین محمد

۱؎ مگر دیباچے سے معلوم ہوتا ہے کہ شیراز سے عراق یعنی اصفہان آئے ۲؎ تقی کے بیان کے مطابق ۱۴ روز سے چند دن زیادہ ہو گئے ملاحظہ ہو دیباچۂ عرفات ۳؎ دیباچے میں "امور ضروری" اور متن میں (ورق ۲۱، ا) "بالضرورت" ہے ۴؎ تقی کے الفاظ یہ ہیں "از آں جا بہ دیگر جہات مرور و عبور فرمود" ۵؎ یہ واقعہ دیباچہ اور ورق (۲۱، ا) دو جگہ ہے، آخری مقام سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہندوستان بالارادہ نہیں بلکہ اتفاقاً آگئے تھے ۶؎ مثلاً صاحب ریاض الشعراء، صبح گلشن ص ۸۸، گلدستہ میں میر تقی الدین ملتا ہے (دیباچہ) ۷؎ دیباچۂ عرفات ۸؎ اودھ کیٹلاگ ص ۷، ۹؎ بانکی پور کیٹلاگ (فارسی) ج ۸ ص ۵، ۱۰؎ مثلاً صحف ابراہیم ص ۲۸۸۔

ہی ہو؛ اور اس نے محض خاکساری کے طور پر اپنے نام کا صرف ایک ہی جز لکھدیا ہو، دیباچے میں ایک بار اس طرح نظم بھی ہوا ہے:

گوہرم پاک و متقی آمد نامم از آسمان تقی آمد

جیسا عرض کیا جا چکا ہے تقی کے والد ابتدائے ۹۷۲ھ میں اصفہان آئے اور یہیں شادی کی اور صرف چند دن قیام کر کے سفر پر روانہ ہو گئے، دوسرے سال کی بالکل ابتدا میں ۲ محرم ۹۷۳ھ بروز چہارشنبہ تقی کی پیدائش ہوئی، ذیل کی عبارت میں تقی نے جو تفصیلات[1] لکھی ہیں ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ غالباً ان کی والدہ کا نام زہرا تھا، اور شادی کے صرف ایک سال کے اندر ہی ان کی پیدائش واقع ہوئی،

چوں بحسب ارادت ازلی و توفیق سعادت لم یزلی والد بزرگوار این ذرہ از شیراز بعراق آمد از نیسان صلب او در رحم سمی زہرائے کہ درج این گوہر یتیم است لولوے وجود نقش پذیرفتہ... با آنکہ زمان اتصال این دو کوکب مقارن در اوج سعادت... چہل دور کامل شبا روزے فلک الافلاک متجاوز نہ شدہ بود خورشید ہستی این ذرہ در بیت الشرف مشیمہ طالع شدہ۔

ابھی تقی پیدا بھی نہ ہوا تھا کہ اس کے والد کو شیراز جانا پڑا، پھر وہ ہندوستان چلے گئے اور وہیں سپرد خاک ہوئے، مگر تقی کی ماں نے جس طرح اس کی پرورش کی وہ تقی کے الفاظ میں سنیے:

آں مریم زماں دایہ وار بپرورش در آمدہ بشیر مہربانی از پستان کامرانی می داد و خود رابعہ وار در عنفوان جوانی با کمال حسن از سر لذات نفسانی و ہوا و ہوس جسدانی عالم فانی در گذشتہ مردانہ در صورت مادری بہ مقام پدری در آمدہ دہقان نہال طبع مرا از جوئبار

۱؎ یہ ساری تفصیل دیباچۂ عرفات میں ملتی ہے

دانش آب داده تربیت کرد۔

تقی ایک سال کا ہوا تو دودھ بڑھائی ہو گئی، مگر ہونہار بچے کی نشو و نما پر اس کا کوئی اثر نہیں ہوا، لڑکپن ہی میں وہ نہایت باشعور تھا، ذہانت و حافظے کا یہ حال تھا کہ تذکرۂ عرفات لکھتے وقت جب کہ وہ پچاس سال کا ہو چکا تھا، شیرخوارگی کے بہت سے واقعات یاد تھے، چار سال کا ہوا تو مکتب جانے لگا، تھوڑے عرصہ میں نہ صرف قاری قرآن مجید ہو گیا، بلکہ "گفت و شنید" پر پوری قدرت حاصل ہو گئی، پھر صرف و نحو کی تعلیم شروع ہوئی، اس کے بعد فقہ، منطق اور ریاضی پڑھنے لگا، پھر حکمت و اخلاق کی تعلیم شروع کی، تحصیل علم کا ذوق و شوق قابل دید تھا۔

تقی اوحدی نے کئی مکتب میں تعلیم حاصل کی اور جس مدرسے میں جاتا اپنی ذہانت و استعداد کا سکہ بٹھا آتا تھا، اس زمانہ میں اصفہان میں ایک مکتب شاہ طہماسپ[1] صفوی کا قائم کردہ تھا، جس میں صحیح النسب سادات یتیم بچے تعلیم و تربیت حاصل کرتے، اس مدرسے کے ناظم شیخ الاسلام شیخ علی منشا تھے، تقی اوحدی بھی اس مکتب میں داخل ہوا، اور شیخ الاسلام کی توجہ سے علم کی دولت سے مالا مال ہو گیا،

پس این ذرہ بہ تربیت باطنی آں آفتاب سپہر ولایت دراں مکتب بہ کسب کمال اشتغال نمودہ دولت خلافت یافت۔

تقی کو ۸۔۹ سال کی عمر ہی سے شعرگوئی کی مشق ہو گئی تھی، وہ لڑکوں کے مشاعرے میں شرکت کرتا تھا، ایک مشاعرہ کا ذکر اس طرح کرتا ہے:

تا روزے در اثنائے مشاعرہ بہ نحوے کہ مابین اطفال مقرر می باشد بہ سر حرف تے کہ

---

[1] شاہ طہماسپ نے ایک خواب دیکھا تھا، جس کی بنا پر سارے شہر میں اس طرح کے مدارس قائم کر دیے تھے، ان مدرسوں کا روزینہ بھی سرکاری خزانے سے مقرر تھا۔

در عدد با اسم تقی متحد است در ماندم ..... ناگاہ درے از غیب کشودہ شد، ایں بیت بزبانم جریان یافت ؎

ثنا گفتم دعا کردم چو بلبل ہمی نالم ز عشق روئیت اے گل

والدہ شاعری سے منع کرتی تھیں، مگر وہ باز نہیں آتا تھا، بارہ سال کا ہوا تو ماں کا بھی سایہ سر سے اٹھ گیا، جب اس کا کوئی نگراں نہ رہا تو اصفہان سے باہر چلا گیا، مگر پھر جلد واپس چلا آیا، اور سولہ[1] سال کی عمر یعنی ۹۸۹ھ تک اصفہان ہی میں رہا۔

سفر و قیام شیراز و اصفہان وغیرہ

تقی نے اپنی عمر کی ۱۶ منزلیں اصفہان میں طے کیں، وہاں اس کے ننھیال کے لوگ تھے، مگر آبا و اجداد کا وطن دور تھا، والدہ کے انتقال کو ۴ سال گذر چکے تھے، اس لیے تحصیل علم کے ساتھ تلاش معاش کی بھی فکر ہو گئی، فارس میں کچھ رشتے کے لوگ تھے، اس لیے قسمت آزمانے اس طرف نکل آیا، شیراز میں پہنچ کر تحصیل علم کا شوق اور زیادہ ہوا، اس دیار کے شعراء و فضلاء کی صحبت اس کو بے حد پسند آئی اور یہاں پورے چار سال (یعنی ۹۸۹ھ سے ۹۹۳ھ[2] تک) گزار دیے، مولانا میر فانی[3] کی صحبت خاص طور پر اس کو بہت راس آئی، اور ان کی خدمت میں کسب کمال کرتا رہا، مولانا مذکور تقی کے والد کے چچا زاد بھائی اور اس کے حقیقی پھوپھا بھی تھے (عم زادہ پدر و ہمسر عمۂ کمینہ) انھوں نے تقی کے جوہروں سے متاثر ہو کر اپنی لڑکی منسوب کرنا چاہی مگر اس نے شادی سے انکار کر دیا، کیونکہ وہ طے کر چکا تھا کہ تمام عمر شادی نہ کرے گا، چنانچہ

---

[1] یہ ساری تفصیل دیباچۂ عرفات سے ماخوذ ہے۔ [2] اسپرنگر نے کلیات تقی کے توبخانے والے نسخے کی جو تفصیل درج کی ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ سنہ ۹۹۱ھ میں تقی شیراز میں تھا، بعض نظموں پر یہ سنہ اور مقام شیراز درج ہے، ملاحظہ ہو اودھ کیٹلاگ ص ۱۰۷۔ [3] یہ نام مشکوک ہے، بانکی پور کیٹلاگ ص ۱۰۱ پر "فارسی" ہے، بلینڈ نے رائل ایشیاٹک سوسائٹی جرنل ج ۹ ص ۱۳۵ پر (Mircay) لکھا ہے۔

تذکرہ عرفات لکھتے وقت جبکہ وہ پچاس سال پورے کر چکا تھا، اس قید سے آزاد تھا،

بظاہر شادی سے انکار کا سبب یہ ہوگا کہ اس نے ازدواجی زندگی کا ایک نہایت عبرتناک نقشہ خود اپنے گھر میں دیکھا تھا، اس کے والدین کی شادی کو ابھی سال بھر نہ ہوئے تھے کہ اسکے والد کا وفعۃً انتقال ہوگیا، اور اس کی کمسن والدہ کو داغ بیوگی لگا، مگر اس باعزم عورت نے نہایت مستقل مزاجی سے حالات کا مقابلہ کیا، اور اپنی امید کے آخری سہارے کی تربیت بڑی اولوالعزمی سے کی، مگر قسمت کچھ اور ہی دکھلانے والی تھی، ابھی یہ ہونہار لڑکا پورا جوان بھی نہ ہوا تھا کہ وہ بی بی بھی آخرت کو سدھاری،

تقی نے ایک جملے میں ان واقعات کی طرف اشارہ کیا ہے جس سے قیاس ہوتا ہے شادی نہ کرنے کا عزم اسی تجربے کا نتیجہ تھا،

بہرحال شیراز کے چار سالہ قیام میں تقی نے کسب کمال میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا، اسکے بعد ۹۹۷ھ میں جب اس نے عراق یعنی اصفہان کی طرف مراجعت کی تو بقول[۱] خود "درہمہ حالات منفرد و در جمیع کمالات مستعد بودم"،

ان دنوں یعنی ۹۹۵ھ میں سلطان محمد خدابندہ فرماں روائے ایران لشکر سمیت اصفہان میں پڑا تھا، تقی اوحدی اس کے لشکر میں داخل ہوگیا، شاہی لشکر نے اصفہان میں بڑا فساد برپا کر رکھا تھا، اس لیے شاہ عباس خراسان سے قزوین آیا اور خدابندہ پر فوج کشی کرکے اسے زیر کیا اور تقی نے شاہ عباس کے دربار میں رسائی حاصل کی، تھوڑے ہی دنوں بعد شاہ عباس کاشان و قم کی طرف چلا گیا، تقی اوحدی بھی امرا کے ساتھ وہاں پہنچا، اور ایک سال تک وابستگان شاہی کے ساتھ محفل شعر و سخن گرم کرتا رہا، رفتہ رفتہ اپنی سخنوری کا

۱؎ دیباچۂ عرفات

سکہ بادشاہ پر پوری طرح بٹھا دیا، اس نے اس کی بڑی عزت و تکریم کی، کاشان ہی[۱] میں اس کی ملاقات مولانا فہمی[۲]، حاتم[۳] اور غضنفر سے ہوئی اور ان سے شاعرانہ معرکے بھی ہوئے،

ایک سال[۴] کے بعد تقی اوحدی دربار شاہی کے متوسلین میں سے ایک کے ہمراہ جو تقی کا گہرا دوست تھا، اصفہان آیا اور یہاں سے شیراز گیا، جہاں وہ ۹۹۶ھ کے کچھ بعد ہی پہنچا ہوگا، شیراز میں ان دنوں یعقوب خاں حکمراں تھا، ۹۹۹ھ کے قریب وہ بھی شاہ عباس کے ہاتھوں مغلوب ہوا اور شیراز شاہان صفویہ کی حکومت میں براہ راست آگیا، تقی اوحدی ۱۰۰۱ھ کے قریب تک شیراز ہی میں مقیم رہا اور وہاں کے اس تین، چار سالہ[۵] قیام میں شعر و سخن کی محفل گرم ہوتی رہی، اس سنہ میں تقی پھر اصفہان آیا اور شاہ عباس کی فتح خراسان اور عبداللہ خاں و عبدالمومن خاں کی ہزیمت کی خوشخبری سنی، اس خوشی میں میدان ہارون اور اصفہان میں چراغاں ہوا، تقی اوحدی نے حسب ذیل رباعی بادشاہ کی خدمت میں پیش کی،

میدان[۶] صفاہان کہ زماہ دیہ دیں	صد داغ نہادہ بردل چرخ بریں
نے گشتہ چراغاں کہ پے سجدۂ شاہ	افتادہ کواکب اندر روئے زمیں

بادشاہ کو یہ رباعی بہت پسند آئی، اور دوسرے شعراء سے اسی موضوع پر رباعی نظم کرنے کی فرمائش کی، مگر کسی کی رباعی اتنی پسند نہ آسکی، خود تقی نے دوسری اور رباعیاں نظم کیں مگر ان میں وہ حسن و دلآویزی نہ پیدا ہو سکی،

۱؎ تقی ۱۰۰۱ھ کے قریب دوبارہ کاشان گیا تھا، مگر فہمی، غضنفر، اور حاتم وغیرہ سے پہلی ہی بار ملاقات ہوئی ہوگی، کیونکہ دوسرے موقع پر تینوں انتقال کر چکے تھے ۲؎ ملاحظہ ہو عرفات ورق ۵۱۹، ۳؎ ایضاً ورق ۵۲۲ ۴؎ یہ ساری تفصیلات دیباچۂ عرفات سے ماخوذ ہیں ۵؎ تقی نے خود پانچ سال تجویز کیے ہیں لیکن ۹۹۶ھ کے بعد وہاں پہنچنا اور ۱۰۰۱ھ سے قبل وہاں سے واپس آنا یقینی ہے، بظاہر پانچ سال کسی سہو کا نتیجہ ہے ۶؎ یہ رباعی صحف ابراہیم ص ۲۸۹ پر مندرج ہے، تیسرے مصرع کا پہلا حرف "نے" کے بجائے "ز" ہے۔

اب تقی کی قدردانی میں روز افزوں ترقی ہوتی گئی، یہاں تک کہ بادشاہ سفر و حضر میں اسے اپنے ہمرکاب رکھتا، ۱۰۰۱ھ کے قریب اردوئے معلی کے ساتھ اصفہان سے قزوین گیا، وہاں شعراء کے ساتھ "ہنگامۂ سخن گرم" کیا، بادشاہ بھی شاعرانہ محفلیں قائم کرتا، خود تقی کے الفاظ یہ ہیں:

"در قزوین...... ہنگامۂ سخن بغایت گرم بود چہ در مجلس حضرت بادشاہ نیز غوغا طرح می شد و ذکر شعرائے آں عصر ان شاء اللہ تعالیٰ ہر یک بجائے خویشتن بقدر امکان مشروح خواہد شد"

شاہ عباس نے تقی کو اتنا سربلند کر دیا کہ لوگ اسے شاعر بیگ کہہ کر پکارتے تھے، اس نظر التفات کا یہ نتیجہ ہوا کہ محض اسے تنہا قزوین سے اصفہان لائے، شانی تکلو جس پر انعام شاہی کی اتنی بارش تھی کہ وہ سونے میں تولا گیا تھا، مگر وہ بھی بادشاہ کی محبت سے محروم رہا اور اسے قزوین ہی میں چھوڑ دیا گیا، یہ واقعہ ۱۰۰۲ھ کے قریب کا ہوگا۔

اصفہان آتے ہوئے شاہی لشکر کا گزر کاشان میں ہوا، اس وقت وہاں پر سید احمد کے فتنے نے بڑا سر اٹھا رکھا تھا، بادشاہ نے پہلے اس کو قتل کرا دیا، پھر اس کے بعد اس کے بہت سے ساتھیوں کو بھی موت کے گھاٹ اتار دیا، قزوین میں بھی سید مذکور کے بہت سے معتقدین اس کے قبل ہی قتل ہو چکے تھے، کاشان میں باقر کاشی جو بعد میں بیجاپور آکر دربار عادلشاہی سے منسلک ہو گیا تھا، اسی فتنے کی وجہ سے ماخوذ تھا، بادشاہ نے بنفس نفیس واقعہ کی تحقیقات کی تو باقر بے قصور ٹھہرا، اس وقت تقی اوحدی اور باقر کاشی کی ملاقات ہوئی ہوگی۔

شاہی لشکر اصفہان میں صرف ایک سال کے قریب مقیم رہا ہوگا، ۱۰۰۳ھ میں جب کوچ ہوا تو تقی نے اس کے ہمرکاب جانے پر رضامند نہ ہوا، اور بیماری کا عذر کر کے لشکر سے علیحدہ ہو گیا، اور ۱۰۰۴ھ تک اصفہان ہی میں مقیم رہا، اس کے بعد ایک سال کے لیے یزد

چلا گیا، ۱۰۰۵ھ میں وطن لوٹا، مگر کچھ ہی دنوں کے بعد عتبات عالیہ کی زیارت کا شوق دامنگیر ہوا، چنانچہ چار سال تک مقامات مقدسہ کی زیارت کرتا رہا، نجف اشرف میں قیام زیادہ رہا، خود تقی نے یہاں کے قیام کی مدت ۴ سال تبلائی ہے، جس میں کچھ غلطی معلوم ہوتی ہے، کیونکہ مصنف ہی کے بیان سے وطن کی واپسی کی تاریخ ۱۰۰۹ھ ہے، اس سفر کی مدت کا زیادہ حصہ نجف ہی میں گزرا، اس سے اس کی اس عقیدت کا پتہ چلتا ہے جو حضرت علیؑ کے ساتھ تھی، مغیث محوی کے حالات[1] کے ضمن میں لکھا ہے کہ ۱۰۰۶ھ میں زیارت کے دوران میں اس سے ملاقات ہوئی، اور تین چار سال کا زمانہ اس کے ساتھ گزرا، اس بیان میں یا تو ۱۰۰۶ھ غلط درج ہے، یا تین چار سال کی مدت کچھ زیادہ درج ہو گئی ہے، کیونکہ ۱۰۰۹ھ میں وطن کی واپسی بہت کچھ یقینی سی ہے،

زیارت سے واپسی ہمدان کی راہ سے ہوئی، ممکن ہے میر مغیث محوی بھی ساتھ رہا ہو، اور وہ اپنے وطن ہمدان آیا ہو اور اسی کے ساتھ تقی اوحدی بھی ہمدان کی راہ سے وطن کی طرف لوٹا ہو، بہرحال ۱۰۰۹ھ میں اصفہان آیا اور یہاں تقریباً ۵ سال یعنی ۱۰۱۴ھ[2] تک مقیم رہا، اس کے بعد ہندوستان کا سفر اختیار کیا،

سفر ہند، حرکت از اصفہان و شیراز و قیام لاہور و آگرہ، و گجرات

تقی اوحدی نے یکم رجب ۱۰۱۵ھ[3] کو ہندوستان کے ارادہ سے رخت سفر باندھا، اس کے ساتھ دوستوں کی ایک

[1] عرفات العاشقین ورق ۶۹۹ ب [2] میرے پاس دیباچۂ عرفات کی جو عبارت نقل کی ہوئی ہے اس میں ۱۰۱۲ھ ہے، لیکن رجب ۱۰۱۵ھ میں وطن سے نکلنا مسلم ہے، اسلیے بانکی پور کیٹلاگ کی دی ہوئی تاریخ یعنی ۱۰۱۴ھ صحیح سمجھی گئی، بہرحال ۱۰۱۲ھ کے بعد تک تقی کا قیام اصفہان کلیات متذکرۂ اسپرنگر سے بھی ثابت ہے [3] دیباچہ میں یہی تاریخ ہے، اسکی مزید تائید ریاض الشعراء (قلمی لکھنؤ) اور صحف ابراہیم (ص ۲۸۸) سے ہوتی ہے، مگر صبح گلشن ص ۸۸ پر خمس و الف یعنی ۱۰۰۵ھ درج ہے جو غلط ہے۔

خاصی جماعت تھی، جو ہندوستان میں قسمت آزمائی کرنے آرہی تھی، یہ وہ سنہ تھا، جبکہ اکبر کا ستارۂ غروب ہو چکا تھا، اور سریر ہند پر شاہزادہ سلیم جہانگیر کے لقب[1] سے متمکن تھا، ایرانیوں کو اکبر کی فیاضی ہی ہندوستان کی طرف کھینچی تھی، اس لیے اس کے مرنے کی خبر سے تقی اوحدی اور اس کے ساتھیوں کو اپنے تاخیر سفر پر تاسف ضرور ہوا ہوگا، مگر ان کو نئے بادشاہ سے بھی بہت سی توقعات وابستہ رہی ہوں گی،

تقی کے ہمراہیوں میں دو کا حال ہمیں معلوم ہے، ایک آقا تقی معرف بن ملک معرف[2] اصفہانی ہے، جو تقی اوحدی کا نہ صرف ہم وطن تھا، بلکہ دونوں کے مکان بھی ایک ہی محلے میں پڑوس ہی میں تھے، دونوں کے بزرگوں میں بڑا اختلاط تھا، چنانچہ تقی نے آقاے معرف اور اس کے بھائی معزالدین محمد سے خاندانی دوستی برقرار رکھی،

تقی دولت حسن سے مالامال[3] تھا، ابتدائی زندگی میں بال خورہ[4] ہو جانے کی بنا پر شعرا نے بہت اچھے شعر اس کی مدح میں لکھے ہیں، سنجر کاشی کو بھی تقی سے بڑی[5] دلبستگی تھی، چنانچہ اس نے بھی ایک شعر اس موقع پر لکھا تھا،

بقلم نمی برد فرمان تو | ز چشم تو افتاد مژگان تو

اوحدی کے ساتھ تقی ہندوستان آیا اور مدت تک شہزادہ پرویز[6] بن جہانگیر کی خدمت

[1] توزک میں تخت نشینی کی تاریخ روز پنجشنبہ ہشتم جمادی الثانی ۱۰۱۴ھ دی ہے (توزک ص ۲) [2] اسکے حالات کے لیے ملاحظہ ہو عرفات العاشقین ورق ۱۶۶، ماثر رحیمی ج ۳ حصہ ۲ ص ۱۴۷۶، [3] معرف سرکاری عہدہ ہے، غیاث اللغات میں ہے "آں کس باشد کہ در مجلس سلاطین مردمان را بجاے لائق ہر کدام نشانند" [4] مثلاً ملاحظہ ہو عرفات العاشقین ورق ۱۶۶، ماثر رحیمی ص ۱۴۷۷ [5] اس مرض کی وجہ سے داء الثعلب کے لقب سے مشہور ہوا [6] اسکے خاص دوستوں میں حکیم شفائی، وقاضی بدیع الزمان خصوصیت سے قابل ذکر ہیں [7] خان خاناں سے بھی متعلق معلوم ہوتا ہے، ماثر رحیمی میں اس کے حالات ملتے ہیں،

میں رہا، اس کے ہمراہ برہان پور گیا، وہیں شاہزادے کے دربار میں اسکے اور حکیم رکن الدین مسعود کاشانی کے درمیان مناظرہ ہوا، ۱۰۲۱ھ میں برہان پور ہی میں اس کی وفات ہوئی، تقی اوحدی نے اس کی زیرکی و دانائی کی بڑی توصیف کی ہے۔

دوسرا ساتھی مجرم[1] تخلص ایک شاعر تھا، جس کا نام قلی خاں بیگ، ابن حسن سلطان شاملو تھا، تقی کے ہمراہ ہندوستان آکر ۱۰۲۰ھ میں یہیں سپرد خاک ہوا، ریاض الشعراء سے پتہ چلتا ہے کہ وہ اپنے زمانے کا نہایت ممتاز شاعر تھا، موسیقی میں بھی کمال رکھتا تھا، غالباً سپہ گری کے فن سے واقفیت رکھتا تھا کیونکہ اس کی شجاعت کی غیر معمولی تعریف ملتی ہے، تقی اوحدی نے اسکی وفات کے بعد (۱۰۲۰ھ) اس کے دیوان کو مرتب کیا، مگر ریاض الشعراء تقی پر سرقہ کا الزام عائد کرتا ہے، چنانچہ لکھتا ہے

بخاطر راقم حروف می رسد کہ تقی اوحدی اشعار بلندے کہ از خود ذکر کردہ است
اکثر از آں بیچارہ خواہد بود کہ بحق الوصایت متصرف شدہ۔

تذکرہ مذکور میں اس کے سات شعر کا انتخاب دیا ہے،

حیدر ہمدانی[2] اوحدی کا تیسرا ساتھی تھا، جو تقی کے ساتھ ہندوستان کے سفر میں شریک تھا، اسی کے مشورہ سے تقی نے فردوس خیال کی ترتیب دی (جرنل رائل ایشیاٹک سوسائٹی ج ۹ ص ۱۲۵)

تقی اپنے دوستوں کے ہمراہ اصفہان سے شیراز آیا، یہاں ۱۰۱۵ھ میں پہنچا، چنانچہ نصیرائے ہمدانی سے شیراز میں اسی سنہ میں ملاقات ہونے کی اطلاع ریاض الشعرا[3] سے ملتی ہے، یہاں کچھ

[1] ملاحظہ ہو ریو ج ۳ ص ۱۰۹۳ [2] حیدر غیر معروف شاعر ہے، اس کے حالات تذکروں میں نہیں ملتے، ریاض الشعرا اور صحف ابراہیم (۱۸۸) پر جس حیدر ہمدانی کا ایک سطر میں ذکر ہے وہ دوسرا شاعر ہے۔

[3] ریو ج ۲ ص ۱۰۹۳

کچھ دنوں ٹھہر کر اپنے سفر پر براہ خشکی روانہ ہوا، اور کرمان آیا، پھر قندھار پہنچا، ان دنوں قندھار میں بڑا طوفان برپا تھا، اکبر کے مرتے ہی حاکم ہرات[۱] نے اس پر حملہ کرکے شاہ بیگ حاکم قندھار کو مقید کرلیا، اس کی اطلاع پاتے ہی جہانگیر نے مرزا غازی ترخان کی سرکردگی میں ایک فوج بھیجی[۲] جو ۱۲ر شوال ۱۰۱۵ھ میں قندھار میں داخل ہوئی اور چند ہی دنوں میں یہ فتنہ فرو ہوگیا، اور شاہ بیگ کے بجائے سردار خاں وہاں کا حاکم مقرر ہوا، لیکن قندھار کی طرف سے جہانگیر کو یکسوئی نہ ہوئی، اس لیے دسویں رمضان ۱۰۱۶ھ[۳] میں مرزا غازی کو پنج ہزاری منصب دار بنا کر ولایت ٹھٹھ[۴]، ملتان اور قندھار کا حاکم بنا دیا،

ظاہر ہے کہ مرزا غازی کی حکومت قائم ہونے سے پہلے تقی اوحدی قندھار پہنچا تھا، ورنہ ایسے شائق علم و ادب اور قدردان شعر و فن کے دامن دولت سے وابستگی ضرور ہوتی، مرزا غازی کی علم دوستی کا یہ عالم تھا کہ طالب آملی، مرشد بروجردی، سنجر کاشی، اسد قصہ خواں وغیرہ متعدد شعراء اس کے دربار کی زینت تھے، مگر تقی اوحدی نے مرزا کے[۵] جو حالات بیان کیے ہیں ان سے مصنف کی بے تعلقی پوری طرح نمایاں ہوتی ہے،

تقی اوحدی قندھار[۶] سے لاہور پہنچا، اور غالباً اب اس کے سفر کو ایک سال کے قریب ہو چکا ہوگا، اس لیے لاہور کے ورود کو ۱۰۱۶ھ میں سمجھنا چاہیے، ان دنوں جہانگیر کا قیام لاہور ہی کے اطراف میں تھا، وہ خسرو کے تعاقب میں ۹ر محرم[۷] ۱۰۱۵ھ کو لاہور پہنچا اور ۲۰ر ذی الحجہ ۱۰۱۵ھ تک یہاں رہا، ذی الحجہ میں سفر کابل پر روانہ ہوا، ۱۴ر صفر ۱۰۱۶ھ کو کابل پہنچا، اور ۱۴ جمادی الاول ۱۰۱۶ھ کو وہاں سے روانہ ہو کر ۱۳ر شعبان سنہ مذکور میں لاہور پہنچا، اور پورا رمضان گذارنے

---

[۱] تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو تزک جہانگیری ص ۴۴، ۳۲، ۲۲ [۲] تزک ص ۴۲ [۳] ایضاً ص ۴۳ [۴] عرفات ورق ۵۱۸ ب

[۵] تفصیل دیباچہ عرفات میں درج ہے [۶] تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو تزک ص ۴۲، ۳۴، ۴۲، ۴۴، ۵۱، ۵۶، ۶۳، ۶۵، ۶۶

کے بعد آگرہ روانہ ہوگیا، اس سے یہ قرین قیاس ہے کہ ہمارا نو وارد ایرانی مصنف لاہور کے قیام کی ابتدا میں جہانگیر کے دربار میں پہنچنے کی کوشش کر چکا ہوگا،

تقی اوحدی نے لاہور میں پورے ڈیڑھ[۱] سال گزارے، مگر یہاں کا کوئی قابل ذکر واقعہ معلوم نہیں، ممکن ہے جہانگیر کے یہاں رسائی ہوئی ہو، مگر خود مؤلف نے اس کے بارے میں غیر معمولی سکوت اختیار کیا ہے،

وسط ۱۰۱۸ھ کے قریب تقی آگرے کی طرف آیا اور یہاں اس کے سال سوا سال قیام کرنے کی اطلاع ملتی ہے، ان دنوں بادشاہ بنفس نفیس دار الخلافہ میں موجود تھا، مگر تقی کی دربار میں بازیابی کی کوئی اطلاع نہیں ہے، پھر وہ گجرات کے ارادے سے روانہ ہوا، اور غالباً وسط ۱۰۱۹ھ میں وہ گجرات پہنچا ہوگا، یہاں اس کی ملاقات نظیری نیشاپوری[۲] (متوفی ۱۰۲۱ھ یا ۱۰۲۳ھ) سے ہوئی، اس کے یہاں شعر و سخن کا بڑا چرچا رہتا تھا، تقی اوحدی ان محفلوں میں شریک ہو کر داد سخنوری دیتا تھا، چنانچہ خود لکھتا ہے[۴]

وقتے کہ بندہ در گجرات بودم اکثی در تکمیل ہزار و بست۔ ایں دو عزیز (ظہوری و ملک) اشعار مجدد فرمودۂ خود را بالتمام نزد مولانا نظیری نیشاپوری فرستادہ بودند و در صدد جواب غزلیات وغیرہ در آمدہ ہمہ را جواب گفتہ و ہمہ را مطرح شعرائے آں جا ساختہ۔ بندہ ہرچند غزل بر حسب اتفاق تتبع نمودہ رفاقت بایشان نمودہ ایم۔

---

[۱] دیباچۂ عرفات[۲] نظیری کے ذیل میں یہ جملہ ملتا ہے: در ۱۰۱۶ھ کہ در دو مولف در ایں عہد در دیار تتبع شد (ورق ۶۹۷ ا) گو یہ تاریخ سہو سے خالی نہیں، بہر حال اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ شیراز، لاہور اور آگرہ کے قیام کی مدت تین سال ہی نہ ہوگی، ۱۰۱۸ھ کے وسط میں وطن سے نکلا تو ۱۰۱۸ھ کے وسط میں گجرات گیا ہوگا، اسی طرح قیام گجرات کی مدت دو سہ سال ۱۰۲۰ھ کے خاتمہ پر لکھی ہے، اس میں بھی ۱۰۱۶ھ غلط ہے[۳] نظیری ذیقعدہ ۱۰۱۹ھ میں آگرہ آیا (تزک ص ۹۲) اور چند دنوں بعد پھر گجرات واپس چلا گیا[۴] عرفات ورق ۱۴۳ ب

ملک قمی (متوفی ۱۰۲۵ھ) کے ذیل میں بھی یہی واقعہ مندرج ہے[1]: "در دو سہ سال کہ بندہ در گجرات بودم" کے جملے سے ورود گجرات کی تاریخ ذرا کچھ قبل ہو جائے گی، جو کسی طرح صحیح نہیں ہو سکتی، وطن سے نکلے ہوئے تین سال ہو چکے ہیں اور وہاں سے ۱۰۱۵ھ میں برآمد ہونا پوری طرح متحقق ہے۔

گجرات یعنی احمد آباد میں تقی نے زیادہ دن قیام کیا، مگر قسمت میں گردش تھی، اس لیے ایک جگہ جم کر رہنے کی کوئی صورت نظر نہ آئی، یہاں سے پھر آگرہ واپس گیا، بانکی پور کیٹلاگ[2] میں ورود آگرہ کی تاریخ ۱۰۲۰ھ دی ہے، جو غلط معلوم ہوتی ہے، کیونکہ اولاً شیراز سے روانہ ہونے کے وقت سے قیام گجرات تک کی مدت ۹ سال[3] لکھی ہے، اور شیراز سے اواخر ۱۰۱۵ھ تک برآمد ہونا ممکن نہیں، اس لیے اواخر ۱۰۲۱ھ تک قیام گجرات ثابت ہے، ثانیاً لاہور[4] (۱½ سال) آگرہ (۱½ سال) گجرات (تین سال) کے قیام کی مدت پورے چھ سال ہو جاتی ہے، اور لاہور کا ورود ۱۰۱۶ھ سے قبل ممکن نہیں، ثالثاً ۱۰۲۰ھ کے خاتمے تک وہاں کے قیام کی اطلاع ہے، پھر نظیری کی وفات کا مقطع بھی ۱۰۲۱ھ کے قبل کا نہیں ہو سکتا، رابعاً اسپرنگر کی تصریح کے مطابق کلیات میں بعض نظموں پر ۱۰۲۱ھ اور مقام تصنیف گجرات درج ہے، اس لیے میرے خیال میں ورود آگرہ کی تاریخ ۱۰۲۱ھ کے آخری مہینے کی ہو گی، ۱۰۲۲ھ میں اس نے عرفات العاشقین لکھنا شروع کر دیا تھا، اور اس کے شروع کرنے کے قبل وہ آگرہ ہی میں کچھ دنوں رہ بھی چکا تھا،

قیام آگرہ و مراجعت گجرات جیسا اوپر عرض ہو چکا ہے، تقی اوحدی احمد آباد سے آگرہ واپس ہوا، اور یہاں اپنی اہم تصنیف یعنی تذکرہ شعرائے فارسی موسوم بہ عرفات العاشقین کی تکمیل میں مصروف[5] ہوا، اس کام میں اسے دو سال (یعنی ۱۰۲۲ھ تا ۱۰۲۴ھ) لگے، یہی وہ تصنیف ہے جس کی بدولت ہمارے مصنف کا نام زندہ و روشن ہے۔

۱؎ ورق ۷۹،۸۰ ۲؎ ج ۸ ص ۷۷ ۳؎ ملاحظہ ہو دیباچہ عرفات ۴؎ ایضاً ۵؎ ایضاً و نیز گلدستہ ورق ۸۹ ب

یہاں ایک غلط فہمی کا ازالہ ضروری معلوم ہوتا ہے، بعض بیانوں سے یہ گمان ہوتا ہے کہ عرفات کی تکمیل بحکم جہانگیر عمل میں آئی ہو گی، مگر جن دنوں تقی دوبارہ آگرہ گیا ہے ان ہی ایام میں جہانگیر اجمیر چلا گیا تھا، اس کی آگرہ سے روانگی ۲ شعبان[1] ۱۰۲۲ھ کو ہوئی، اور اسی سنہ میں ۵ شوال کو اجمیر پہنچا، وہاں اطراف میں وہ چند سال مقیم رہا، اور وہیں سے آبان ۱۰۲۶ھ میں گجرات گیا، ربیع الاول ۱۰۲۷ھ کا جلوس گجرات ہی میں ہوا، اور ۲۲ رمضان ۱۰۲۷ھ کو وہاں سے واپس ہوا،

ان تفصیلات سے یہ بات صاف ہو جاتی ہے کہ عرفات العاشقین کی تکمیل کے دوران میں بادشاہ آگرہ[2] سے باہر تھا، اور ۱۰۲۶ھ، ۱۰۲۷ھ میں اسکی نظر ثانی کے موقع پر بھی جہانگیر کا دارالخلافہ سے باہر رہنا ثابت ہے،

تقی اوحدی آگرہ[3] سے پھر گجرات گیا، اگرچہ کوئی ایسا قرینہ نہیں ہے جس سے گجرات پہنچنے کی تاریخ متعین کی جا سکے، مگر اسپرنگر[4] نے کلیات تقی اوحدی کے حوالے سے ۱۰۳۱ھ کی لکھی ہوئی

۱؎ ملاحظہ ہو تزک ص ۱۲۳، ۱۲۵، ۱۲۸، ۱۳۸، ۲۲۵، ۲۴۳ ۲؎ تقی نے مرشد بروجردی کے حالات کے ذیل میں جو جملہ لکھا ہے اس سے اسی حقیقت کا انکشاف ہوتا ہے (ورق ۶،۱۱) ۳؎ صبح گلشن ص ۸۸ پر اکبر آباد (آگرہ) اور گجرات کے علاوہ اجمیر کے قیام کا بھی ذکر ہے، ممکن ہے احمد آباد (گجرات) کے بجائے اجمیر (گجرات) چھپ گیا ہو، بہر حال کسی دوسرے بیان سے اسکی تصدیق نہیں ہوتی، مگر جو شخص آگرہ سے احمد آباد اور احمد آباد سے آگرہ دوبار آئے جائے، اس کا اجمیر میں قیام نہ کرنا تعجب خیز ہے، اجمیر درمیانی منزل ہونے کے علاوہ بڑا متبرک مقام ہے، تقی گو مذہباً شیعہ سہی (ملاحظہ ہو مجمع النفائس) گر مشرباً صوفی تھا اور اسکے جد جس پایہ کے عارف تھے، اسکا اندازہ بخوبی ہو چکا ہے، اسلیے اجمیر سے گزرتے ہوئے حضرت خواجہ معین الدین چشتی کے آستانے پر حاضری نہ دینا بعید از قیاس ہے، اس اعتبار سے گو قیام اجمیر کو تقی کی زندگی میں کوئی اہمیت حاصل نہ ہو مگر وہاں کچھ دنوں قیام اغلب ہے ۴؎ اردو کیٹلاگ ص ۵۷۶

نظموں کا مقام تصنیف گجرات بتایا ہے جس سے یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ اس سنہ کے قبل وہ گجرات پہنچ چکا تھا، بظاہر یہاں کے دوبارہ قیام کی مدت طویل معلوم ہوتی ہے، کیونکہ ۱۰۳۶ھ[1] میں انتخاب عرفات موسوم بہ کعبۂ عرفاں گجرات ہی میں عمل میں آیا، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس سنہ کے بعد بھی وہ گجرات میں رہا تھا،

وفات تقی کی زندگی کے ابتدائی پچاس سالہ حالات کا سب سے عمدہ ماخذ خود اس کا تذکرہ عرفات العاشقین ہے، جس کے دیباچے میں اس نے صرف اپنے حالات درج کیے ہیں، مگر بعد کی زندگی کے واقعات نہیں ملتے، یہاں تک کہ اس کی وفات کے اجمال و تفصیل سے بھی ہم قاصر ہیں، صرف دو تین جگہ اس کے سنہ وفات کے بارہ میں کچھ ادھوری باتیں درج ہیں، صبح گلشن[2] میں اس کی وفات کا سنہ "ثلثین والف" یعنی ۱۰۳۰ھ دیا ہے، انڈیا آفس کے فارسی مخطوطات کی فہرست ج ۲ ص ۱۰۲۲ پر بھی سال وفات تقریباً ۱۰۳۰ھ ملتا ہے، لیکن ہم اوپر درج کر آئے ہیں کہ اس تاریخ تک وہ بقیہ حیات تھا، اسپرنگر[3] نے اس کے کلیات میں ۱۰۳۱ھ کی نظمیں دیکھی تھیں، اور گلدستہ[4] میں کعبۂ عرفان کی ایک لمبی عبارت منقول ہے، جس میں خود تقی نے اپنی تصنیفات کی فہرست دی تھی، اس فہرست میں کعبۂ عرفان کا سنہ ۱۰۳۶ھ ملتا ہے، کعبۂ عرفان ہی سے اس نے ایک انتخاب اور کیا تھا، جو انتخاب کعبۂ عرفان کے نام سے موسوم ہوا، اس کی تکمیل ۱۰۳۶ھ کے بہت بعد ہوئی ہوگی، اس اعتبار سے رائل ایشیاٹک سوسائٹی (بنگال) کے کیٹلاگ[5] کی مقرر کی ہوئی تاریخ یعنی ۱۰۴۰ھ صحیح معلوم ہوتی ہے، مگر سردست ہم اس پر تفصیلی روشنی ڈالنے سے قاصر ہیں، اس تاریخ کی صحت کی صورت میں انتقال کے وقت تقی اوحدی کی عمر ۷۰ سال کے قریب رہی ہوگی،

تقی اوحدی کے انتقال پر ایران کے ایک بڑے خانوادہ کی ایک شاخ ختم ہوگئی، کیونکہ

۱؎ گلدستہ ورق ۹۰ ب ۲؎ ص ۸۰۰ ۳؎ ص ۵۰۷ ۴؎ ورق ۹۸ ب ۵؎ ص ۵۲۹

جیسا کہ اس نے عرفات[1] میں درج کیا ہے، وہ مدت العمر ازدواجی زندگی کی قید سے آزاد تھا،

معاصرین سے تعلقات تقی اوحدی اپنے معاصرین کے ساتھ جس طرح ربط ضبط رکھتا تھا عرفات العاشقین اس کی تفصیل سے پر ہے، اگرچہ یہ تفصیلات نہایت اہم ہیں، لیکن یہ مختصر مقالہ نہ ان کا متحمل ہو سکتا ہے، اور نہ وہ موضوع گفتگو سے براہ راست متعلق ہیں، البتہ چند شاعروں سے اس کے تعلقات جس طرح تھے ان کا مختصر سا خاکہ ہدیۂ ناظرین کیا جاتا ہے،

(۱) آقا تقی معرف اصفہانی (متوفی ۱۰۲۱ھ)۔ یہ تقی اوحدی کا بڑا دوست تھا، اور اس کے ساتھ ہندوستان بھی آیا تھا، ہم اس کا مختصر تعارف کرا چکے ہیں، گو وہ "مقبولان و معشوقان اصفہان" میں تھا، مگر اس کی شاعرانہ حیثیت مسلّم تھی، عرفات[2] میں ہے:

بغایت تیز فہم، راست فطرت، سخن سنج، نکتہ فہم بود.... اگرچہ بے دماغ و کم قدرت و قلیل البضاعت بود اما مصرع بلند بہ خاطرش نمی رسید و اکثر اوقات درصحبت قائل و حکیم شفائی کہ از احبائے وے بود و یاران واعزہ دیگر صفاہان بسر می کرد، لیکن با قاضی بدیع الزماں بن قاضی شمس الدین کہ ذکرش گذشت و با مخلص ہم سایہ دیوار بہ دیوار مسجد بود میلے صادق و محبت وافر داشت[3]،

(۲) معز الدین محمد، تقی کا بڑا بھائی تھا، اوحدی اس کے تعلقات کا ذکر ان الفاظ

۱؎ دیباچہ عرفات ۲؎ ورق ۷۶۶ا ۳؎ تقی نے اسکے ۳۳ شعر درج کیے ہیں، چند شعر ملاحظہ ہوں:

عشق رسید و فارغ از کشمکش ہوس شدم   در قفس چمن بدم در چمن قفس شدم

آں پارۂ دلم کہ بہ طوفان آرزد   از چشم روزگار بدامن فتادہ ام

از خون من چگونہ کشد سر کہ عشق را   چوں طوق خون خویش بہ گردن فتادہ ام

گر خوشہ چیں ز نظم دگر وز دخال تخم   چوں مور قحط دیدہ بہ خرمن فتادہ ام

ذکر کرتا ہے[1]:

بندہ نیز با وے (تقی) و برادر بزرگ وے معز الدین محمد (ہر دو در کمال حسن و صفا بودند)

اختلاط تامے داشت و با تقی مذکور در سفر ہند ہمراہ و رفیق بودم۔

معز نے بڑا قوی حافظہ پایا تھا، خمسۂ نظامی و شاہنامہ فردوسی از بر تھے، ۱۰۱۸ھ کے قریب

ہندوستان آیا اور نور الدین قلی کوتوال آگرہ[2] (مقتول ۱۰۳۱ھ) کی صحبت میں بڑی ترقی کی،

شعر بہت کم کہتا تھا، اس کی حسب ذیل رباعی عرفات میں موجود ہے،

بر گرد گلت مشک سیہ بیختہ اند	یا عنبر تر بگرد گل ریختہ اند
زلفت بگرد عارضت نہ بہ غلطم	زنار بروے کعبہ آمیختہ اند

دسویں محرم ۱۰۲۴ھ میں وفات پائی،

(۳) عرفی شیرازی۔ (متوفی ۹۹۹ھ) تقی اوحدی کا مولد تو اصفہان تھا، مگر شیراز سے اس کا

آبائی تعلق تھا، اور اس کے اجداد کے مکانات وغیرہ وہاں موجود تھے، جب پہلی بار ۹۸۹ھ

میں وہ شیراز پہنچا تو عرفی کی صحبت بہت پسند آئی، اور ۴ سال وہاں مقیم رہا، اکثر عرفی ہی کے

ساتھ رہتا، اس کے یہاں اور شعرا بھی موجود رہتے، اور بابا فغانی (متوفی ۹۲۵ھ) کے طرز

میں غزلیں لکھی جاتیں، تقی اوحدی بھی ان صحبتوں میں شریک ہو کر داد سخنوری دیتا تھا، اس کے

قیام شیراز کے ایک سال کے بعد ہی عرفی ہندوستان چلا آیا، عرفی اور تقی میں جس طرح کے

تعلقات تھے ان کا حال خود تقی اوحدی کے الفاظ میں سنیے:

اتحادے با مخلص بسر حدے رسیدہ کہ اکثر شعرا در رشک بودند...... و ما در صحبت

[1] عرفات ورق ۱۶۶۔ [2] یہ عہد جہانگیری کی ایک ممتاز شخصیت تھی، تزک میں اس کا ذکر برابر آتا ہے، (حالات کے لیے ملاحظہ ہو مآثر الامرا ج ۳ ص ۸۱۷، ۸۱۸) [3] عرفات ورق ۵۰۲۔۵۰۳۔

بعضے از اعزہ بعد از وفات او اکثر اشعارش را در صفاہان وغیرہ مطرح ساختہ از قصیدہ

و غزل گفتہ ایم چنانچہ در تذکرۃ العاشقین و تبصرۃ العارفین مذکور و مرقوم است۔

(۴) سنجر کاشانی، (متوفی ۱۰۲۱ھ)۔ میر محمد ہاشم کاشانی الاصل ہے، اس کا باپ میر حیدر

طباطبائی (متوفی ۱۰۳۴ھ) اپنے عہد کا نہایت ممتاز شاعر و قدر دان علما و فضلا تھا، سنجر مدتوں

ہندوستان میں رہا اور یہیں خاک کا پیوند بھی ہو گیا، تقی اوحدی نے عرفات میں[1] لکھا ہے کہ "در

صفاہان مکرر او را دریافتہ بصحبت وے رسیدہ ام"، مگر یہ قطعی معلوم نہیں کہ دونوں کی ملاقات

کس سنہ میں ہوئی، تذکروں سے معلوم ہوتا ہے کہ سنجر اپنے باپ کے ساتھ جلاوطن کر دیا گیا تھا،

میر حیدر ہندوستان روانہ ہو گیا، اور ۹۹۹ھ میں مغلیہ دربار میں پہنچ گیا، لیکن سنجر کے اصفہان

میں رک جانے کے قرائن معلوم ہوتے ہیں، اور وہ وہیں سے ۱۰۱۱ھ میں[2] ہندوستان آیا، تقی

اصفہانی بھی اس سنہ میں اصفہان میں موجود تھا، اور اس کے قبل بھی ۹۹۳ھ، ۹۹۵ھ

تک وہیں تھا، مگر ان دنوں سنجر کی عمر ۱۳ اور ۱۵ سال کے درمیان ہو گی، خیال ہوتا ہے کہ

میر حیدر نے اپنے ۱۳ سالہ لڑکے کو کاشان سے باہر نہ جانے دیا ہوگا، پھر خود تقی کا ایسے نوخیز

کی صحبت میں بالالتزام جانا کچھ مستبعد معلوم ہوتا ہے،

(۵) محتشم کاشی، (متوفی ۹۹۵ھ)۔ ان ایرانی شاعروں میں جو ہندوستان نہیں آئے،

محتشم سب سے ممتاز مانا جاتا ہے، تقی اوحدی باوجود اس کے کہ محتشم کے سب سے بڑے حریف

وحشی یزدی (متوفی ۹۹۱ھ) سے متاثر اور اس کے طرز کا پیرو تھا، محتشم کے بارہ میں لکھتا ہے[4]:

"از اول شاہ طہماسپ تا ظہور شاہ عباس (۹۹۶ھ) در ایران بہ استادی و شاعری مستقل بود"۔

[1] ورق ۳۲۵ ب [2] مثلاً ملاحظہ ہو صحف ابراہیم (خطی بانکی پور، ورق ۱۲۷ مگر مآثر (خطی ورق ۱۲۱) پر صرف باپ کی جلاوطنی کا ذکر ہے [3] مآثر ایضاً [4] عرفات ورق ۶۹۷ ب

تقی اوحدی محتشم سے بھی متاثر تھا، چنانچہ اصفہان میں اس کی خدمت میں حاضری دینے کا شرف حاصل کیا، جیسا کہ خود لکھتا ہے:[1]

بندہ در اوانِ حال نوبتے بہ صفاہان بہ ملازمت مولوی رسیدہ ام

'اوانِ حال' سے یا وہ زمانہ مراد ہے جب تقی اصفہان سے باہر نہیں گیا تھا، اور جب اسکی عمر ۱۰ سال کے قریب تھی، یا وہ زمانہ جب وہ شیراز کے ۴ سالہ قیام (۹۸۹ھ - ۹۹۳ھ) کے بعد دو سال کے لیے یعنی ۹۹۵ھ تک اصفہان میں پھر مقیم ہو چکا تھا، کیونکہ اس آخری سنہ کے بعد ہی محتشم نے رحلت کی تھی،

(۶) مغیث محوی (متوفی ۱۰۱۱ھ)[2]، اسد آباد ہمدان کا رہنے والا تھا، عراق، خراسان، فارس، ہندوستان وغیرہ کا طویل سفر اختیار کر چکا تھا، ۱۰۰۱ھ کے بعد[3] جب وہ ہندوستان سے واپس ہو رہا تھا تو اصفہان میں تقی سے ملاقات ہوئی تھی، پھر عتبات عالیات کی زیارت کے موقع پر دونوں میں ملاقات ہوئی، اور تین چار سال کا زمانہ ساتھ ساتھ گذرا، عتبات کی زیارت سے دونوں ۱۰۰۹ھ میں واپس ہوئے، تقی ہمدان تک مغیث محوی کے ساتھ ساتھ[4] آیا، اور یہاں سے اپنے وطن اصفہان چلا گیا، تین چار سال ساتھ رہنے کی وجہ سے دونوں کی دوستی و اتحاد میں بڑی پختگی ہو گئی، مگر یہ دوستی زیادہ دنوں باقی نہ رہ سکی، کیونکہ واپسی کے ایک ہی سال بعد مغیث کا اپنے وطن ہی میں انتقال ہو گیا،

(۷) مرشد بروجردی (متوفی بعد ۱۰۳۱ھ)[5]۔ اپنے وطن بروجرد سے اصفہان آیا، اور کچھ دنوں قیام کر کے شیراز چلا گیا، وہاں سے سندھ پہنچا اور مرزا غازی بیگ (متوفی ۱۰۲۱ھ) کے

---

[1] ورق ۶۹۰ الف [2] ورق ۶۹۹ ب [3] تفصیلی حالات کے لیے مآثر رحیمی ج ۳ ص ۹۰۹، بعد [4] ہمدان کے علاقہ میں اب بھی ایک مشہور قصبہ ہے، [5] اس کے حالات وغیرہ کے لیے ملاحظہ ہو مآثر ج ۳ ص ۱۸۷ - ۸۸، اور میخانہ ص ۴۰۸ - ۴۱۸

دربار سے متوسل ہو گیا، مرشد خاں کا لقب اسی شہزادے کا عطیہ ہے، ابتدائے زندگی میں جب اصفہان میں مقیم تھا، تقی اوحدی سے ملاقات ہوئی، جیسا کہ عرفات کی اس عبارت[1] سے ظاہر ہوتا ہے:

وقتے کہ مجرد از بہ صفاہان آمدہ بود بہ صحبت ایشان مکرر رسیدہ ام

گمان غالب ہے کہ یہ ملاقات ۱۰۰۰ھ اور ۱۰۰۵ھ کے درمیان ہوئی ہوگی، اس کے بعد ایکبار آگرہ میں ملاقات ہوئی، جیسا کہ حسب ذیل عبارت[2] پتہ دے رہی ہے:

در اثنائے تحریر ایں مقالات بہ آگرہ آمدہ چندے روز او را دریافتم

یہ تذکرہ ۱۰۲۲ھ اور ۱۰۲۴ھ کے درمیان مکمل ہوا، اس لیے دونوں کی ملاقات ۱۰۲۲ھ - ۱۰۲۳ھ کے قریب سمجھنا چاہیے، اسی مصنف کے بیان کے مطابق کچھ دنوں اجمیر میں مقیم رہنے کے بعد مہابت خاں[3] کے ساتھ تھا،

(۸) فہمی کاشانی، (متوفی ۱۰۴۲ھ)۔ نہایت خوش فکر اور نکتہ سنج شاعر تھا، کاشان کے شاعرانہ مناظرے و مباحثے میں بڑا حصہ لیتا تھا، اس کے ہمعصروں میں محتشم، وحشی، شجاع، فہمی، حاتم، مقصود، باقر وغیرہ بڑے درجے کے مناظر تھے، ان میں سے بیشتر کے ساتھ فہمی کا مناظرہ ہوا تھا، تقی اوحدی[4] لکھتا ہے:

او با جمیع شعرائے مشہور مباحثات و منازعات و مجادلات و ہجاجات شدہ

خصوص مولانا وحشی و حاتم وغیرہ

جب تقی شاہ عباس کے ساتھ ۹۹۶ھ[5] میں پہلی بار کاشان پہنچا تو منجملہ اور شاعروں کے فہمی سے بھی ملاقات[6] ہوئی، ایک بار ایک محفل میں تمام اکابر شعرا جمع تھے، فہمی نے وحشی کی برائی

---

[1] ۱۱۷ الف [2] ایضاً [3] عہد جہانگیری کی ایک ممتاز شخصیت، ملاحظہ ہو مآثر الامرا ج ۳ ص ۳۸۵ - ۴۰۹ [4] عرفات ورق ۵۰۶ ب، نیز ملاحظہ ہو خلاصۃ الاشعار و صحف ابراہیم ص ۴۲۹ [5] ملاحظہ ہو دیباچہ عرفات [6] ورق ۵۰۶ الف

شروع کی، چونکہ تقی وحشی کا بڑا مداح تھا اور اسے مرے ہوئے ۴-۵ سال ہو چکے تھے، اس لیے تقی نے اسے ایسا دندان شکن جواب دیا کہ بقول تقی:

"وے چناں منفعل و متنبہ شد کہ در مدت الحیات ہرگاہ بہ وے می رسیدم ایں چنیں در دے ی خلید و دیگر عنان ادب از دست نگذاشت۔"

بہرحال دونوں میں باوجود اختلاف کے ربط وضبط بھی تھا۔

(۹) غضنفر۔ کلجار قم کا ایک قریہ ہے، غضنفر وہیں کا رہنے والا تھا، خوش فکر شاعر اور اپنے عہد کا بڑا مناظر تھا، اگرچہ تقی کے ورود کاشان (یعنی ۹۹۵ھ-۹۹۶ھ) کے وقت وہاں کے بڑے شاعروں میں محتشم، وحشی، مقصود انتقال کر چکے تھے، مگر کاشان کی ادبی رونق باقی تھی، چنانچہ تقی اوحدی نے ان مباحثوں اور مناظروں کی تفصیل بھی لکھی ہے، کاشان میں تقی کی ملاقات اکثر شاعروں سے ہوئی، غضنفر سے کئی بار ملا، عرفات میں ہے:[1]

درکاشان او را اکثر دریافتہ ام۔

(۱۰) باقر کاشانی (متوفی ۱۰۳۴ھ)۔ کاشان کے مشہور شعرا میں تھا، ۱۰۱۲ھ میں وطن سے بیجاپور چلا گیا، اور مدت العمر یہیں رہا، تقی اوحدی ۱۰۰۱ھ کے بعد شاہ عباس کے ساتھ قزوین سے اصفہان آرہا تھا تو راستے میں کاشان سے گذر ہوا، ان دنوں[2] میر سید احمد پر کفر و الحاد کا الزام لگا ہوا تھا، اور حکم شاہی کے مطابق اس کو مع اس کے مریدوں اور عقیدت مندوں کے موت کے گھاٹ اتار دیا گیا، باقر کاشی پر بھی میر سید سے عقیدت مندی کا اتہام تھا، مگر بادشاہ نے بذات خود واقعہ کی تحقیق کی تو معلوم ہوا کہ باقر کا اس سے کوئی خاص تعلق نہ تھا، مگر چونکہ

[1] عرفات ورق ۵۲۲ الف [2] تفصیل کیلیے ملاحظہ ہو عرفات ورق ۱۵۲ ب-۱۵۳ الف اور مآثر رحیمی ج ۳ ص ۷۹۲-۷۹۶،
آخر الذکر سے مزید یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک سال کیلیے قید بھی ہو چکا تھا، مگر موٴلف کا بھائی آقا خضر احاکم کاشان تھا، اسکی سفارش سے رہائی ہوئی۔

سید احمد کے ایک مرید سے اسکے تعلق کی پختگی باقر کے اقرار عقیدت کے بغیر ممکن نہ تھی، اسلیے باقر نے بھی ایک خط اسی طرح کا لکھ دیا تھا، بہرحال قیام کاشان کے دوران میں تقی اوحدی کی ملاقات باقر کاشی سے ہوئی ہوگی لیکن اس ملاقات کو تقی کی زندگی میں کوئی اہمیت حاصل نہیں ہے۔

(۱۱) عبداللہ کامل جہرمی۔ جہرم شیراز میں ایک مقام ہے، عبداللہ مدتوں شیراز میں رہا، گمان غالب ہے کہ وہاں تقی اوحدی سے ملاقات ہوئی ہوگی، اس کے بعد کامل ہندوستان چلا آیا، تقی جب عرفات العاشقین کی تکمیل میں مشغول تھا، تو آگرہ میں ۱۰۲۲ھ میں کامل سے ملاقات ہوئی۔[2]

(۱۲) نظیری نیشاپوری (متوفی ۱۰۲۳ھ) نظیری نے اپنی زندگی کے آخری ایام گجرات میں گزارے، تقی اوحدی جب ۱۰۱۶ھ کے قریب گجرات گیا تو نظیری سے ملاقات ہوئی، اور پھر دونوں میں ایسے تعلقات پیدا ہو گئے کہ تا آخر حیات نظیری یہ اتحاد قائم رہا، جیسا کہ عرفات میں ہے،

در ۱۰۱۶ھ (تصحیف ۱۰۲۰ھ) کہ ورود مولف درآں حدود واقع شد در زمان در گزشتن وے ہمیشہ صحبت اتفاق می افتاد۔[3]

اوپر یہ معلوم ہو چکا ہے کہ ۱۰۲۰ھ میں جب ظہوری اور ملک نے اپنا تازہ کلام نظیری کے پاس بھیجا تھا تو اس نے سب کا جواب لکھا اور دوسرے شعرا سے جواب لکھنے کی فرمائش کی، تقی اوحدی نے بھی جواب لکھنے میں حصہ لیا تھا۔

تقی اوحدی نے نظیری کی وفات پر یہ قطعہ بھی لکھا تھا:[4]

خسرو نظم نظیری کہ خرد — گر نظیرش کند اندیشہ خطاست
چرخ سرگشتہ بتاریخش گفت — مرکز دائرہ بزم کجاست

(۱۳) محمد صوفی مازندرانی (متوفی ۱۰۳۵ھ) سے تقی کی احمد آباد میں ملاقات ہوئی[5] لیکن یہ ملاقات قیام اول کے موقع یعنی ۱۰۲۱ھ کے قبل کی نہیں ہے، کیونکہ عرفات ہی میں دوسری جگہ ہے کہ اس تذکرہ کی تکمیل کے وقت مولانا محمد صوفی احمد آباد میں تھا، بہرحال دوسرے دوران قیام میں یعنی ۱۰۳۰ھ کے قبل ہی دونوں میں ملاقات ہوئی ہوگی، اس ملاقات سے دونوں کے ربط کا پتہ چلتا ہے۔ (باقی)

[1] میخانہ میں مصنف کے دلچسپ حالات ملتے ہیں ص ۴۷۸-۷۹ [2] ورق ۱۹۳۶ [3] ورق ۷۷۹ الف [4] ورق ۴۸۷ ب و ۴۲۲ ب
[5] ورق ۷۷۹ [6] ورق ۷۰۱ الف آثر الامرا ج ۳ ص ۵۰-۴۸ اور میخانہ ص ۴۴۵، ۴۴۶۔

"داروئے جان"

از جناب ڈاکٹر میر ولی الدین صاحب صدر شعبۂ فلسفہ جامعہ عثمانیہ

"باز کشادم بطبیبی دکاں　　مرہم دل دارم و داروے جاں"

آفت و بلا، غم و حزن، اندوہ و درد کے دفع کرنے کا طریقہ جس کی تعلیم خاص طور پر صوفیائے کرام نے دی ہے، جو قرابادین قرآن سے ماخوذ ہے، یہ ہے کہ بلا کے نزول کے وقت نظر مبلی یعنی مبتلا کرنے والے پر رکھی جائے، اور وہ حق تعالیٰ ہی

مَا أَصَابَ مِن مُّصِيبَةٍ إِلَّا بِإِذْنِ اللّٰهِ (سورہ تغابن - ۱)	اللہ کے حکم کے بغیر کوئی مصیبت نہیں پہنچتی،
قُل لَّن يُصِيبَنَا إِلَّا مَا كَتَبَ اللّٰهُ لَنَا (سورہ توبہ - ۷)	کہہ دے ہم کو ہرگز نہ پہنچے گا، مگر وہی جو لکھ دیا اللہ نے ہمارے لیے،

اور یہ ایمان و اذعان تو حاصل ہے کہ "فعل جمیل حقیقی ہمہ از جمال است" "اللہ جمیل و یحب الجمال"، ہاں فرق صرف اس قدر ہو سکتا ہے کہ ایک جگہ جمال جلال کی صورت میں نمایاں ہوتا ہے اور دوسری جگہ جمال جمال ہی کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے، بس ایک عاشق کے الفاظ میں

"بجز اضمحلال در دیدِ نعم و گم شدن و حیران ماندن در التذاذ آنہا کارے نباشد"

یعنی حق تعالیٰ کی نعمتوں کے مشاہدہ میں مضمحل ہو جانے اور اس کی لذت میں گم اور حیران ہو جانے کے سوا کوئی دوسرا کام نہیں!

دوسرے الفاظ میں نزول بلا کے وقت قلب کو بلا پر مرکوز کرنے کے بجائے اس کو جمیع ادراکی قویٰ کے ساتھ مبلی یعنی حق تعالیٰ پر مرکوز کرنا چاہیے اور اس کے جلال کو جمال ہی کی ایک شان اور ایک طور جان کر، اس کی یاد، اس کے شکر سے اس قدر بھر دینا چاہیے کہ لذتِ دید کے سوا کسی اور چیز کا خیال ہی قلب میں نہ آسکے! کسی پختہ کار نے اس کیفیت کو یوں ادا کیا ہے:

وصل تو چوں دست داد ملک جہاں گو مباش	لعل تو چوں حاصل است جوہر جاں گو مباش!
عاشق روے تو نیست طالب دنیا و دیں	آرزوے جاں توئی، کون و مکاں گو مباش!
گردشِ گردوں گر قطع شود گو بشو	حاصلِ نظرت توئی، دورِ زماں گو مباش!
بے تو نیرزد جوے ہر چہ بود در جہاں	مایۂ جاں ہا توئی، سود و زیاں گو مباش!

اس دید کا نتیجہ وہی ہے جو قرآن عظیم میں یوں بیان کیا گیا ہے:

هُوَ الَّذِي أَنزَلَ السَّكِينَةَ فِي	وہی ہے جس نے قلوب مومنین میں اطمینان
قُلُوبِ الْمُؤْمِنِينَ لِيَزْدَادُوا إِيمَانًا	پیدا کیا، تاکہ اور بڑھ جائے ان کا ایمان
مَّعَ إِيمَانِهِمْ (سورہ فتح - ۱)	اپنے ایمان کے ساتھ،

کیا یہ طریقہ آسان ہے؟ قابل عمل ہے؟ جب مصیبت نازل ہوتی ہے تو ہمیں تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ جوف معدہ میں اعصاب کی جو گتھی ہے اس پر ہتھوڑے کی ایک ضرب پڑی، حواس میں اختلال پیدا ہو گیا، تلخیٔ بلا سے دل خون آلود ہو گیا، خوف و حزن کا تسلط قلب و دماغ پر ایسا ہو گیا کہ کچھ بھی سوجھنے نہ لگا، اس "رنج رواں" کے طوفان میں نفس و قلب، روح سب غرق ہو گئے! ہاں یہ سب کچھ صحیح ہے، لیکن کامل علاج صرف ایک ہے، اور وہ ففروا الی اللہ اور تبتل الیہ تبتیلا پر عمل کرنا! نزول بلا کے وقت قلب کی توجہ کا حق تعالیٰ کی طرف ہو جانا ہے، جو بلا میں مبتلا کرنے والے ہیں، اور خود مصیبت و بلا کی طرف سے ہٹ جانا ہے،

صوفیہ کے الفاظ میں "مستانہ وار ایک حملہ کرتا ہے اور علم سے نکل کر معلوم تک جا پہنچتا ہے"[1] یا عاشق وارفتہ کے الفاظ میں معاملہ کی صورت کا یہ ہو جاتا ہے:

قبلہ و محراب من ابروے دلدار است وبس!
این دل شوریدہ را با این چہ و با آن چہ کار (حافظ)

عمل کے لیے علم ضروری ہے، علم قائد عمل ہے۔ یہاں تک کہ کس علم کی ضرورت ہو؟ مجملی کے تمام صفات کے معرفت کی ضرورت ہے، مجملی حق تعالیٰ ہیں، ہر بلا کا ظہور حق تعالیٰ ہی کے علم و حکم سے ہو رہا ہے اور حق تعالیٰ ہمارے مولیٰ ہیں، رحیم و کریم ہیں، لطیف و رؤف ہیں، محسن و منعم ہیں! حق تعالیٰ کی ان صفات کی وجہ سے ان کی رحمت کی امید کا ہمارے دل میں پیدا ہونا ضروری ہے۔ اور حسن ظن کا قائم ہونا اور یہ حسن ظن شیخ جبلیؒ کے الفاظ میں "حوالہ کردن مقاصد خویش بر سابقہ امر عنایت جناب الٰہی است و نظر قلب است بسوے حق بے تطمیع فواد و بے تمنیہ ارواح و نفوس" یعنی اپنے تمام مقاصد کو حق تعالیٰ کی عنایت سابقہ کے حوالہ کرتا ہے اور قلب کی نگاہ کا ان پر جم جاتا ہے۔ ایسی حالت میں قلب سے طمع اور روح و نفس سے تمام تمنائیں نکل جاتی ہیں اور ہم ہیچ سمجھتے ہیں۔

تو در دلی! بغم این و آن کہ پردازد	بجاے جاں کہ تو باشی بجاں کہ پردازد؟
زناز نیست ترا فرصت و مرا زنیاز	کنوں بحال دل ناتواں کہ پردازد؟

صوفیۂ کرام کی اصطلاح میں یہ "جذبۂ خواص" ہے، یعنی "توجہ قلب بسوے حق مع انقطاع عما سواہ"۔ قلب کا حق کی طرف متوجہ ہو جانا اور غیر حق سے کٹ جانا، غیر حق سے خالی ہو جاتا ہے،

دل یافت دیدۂ کہ مقیم ہواے تست (شمس تبریز)

یہی "رضمراد و لا ارادۃ" کا مقام کہلاتا ہے، اس مقام کا انسان "جلال محبوب کو جمال محبوب سے

[1] یک حملۂ مستانہ مردانہ بکردیم — از علم گزشتیم و بمعلوم رسیدیم

بہتر خیال کرتا ہے، وہ درد و الم کو انعام سے زیادہ تصور کرتا ہے۔ جانتا ہے کہ جمال و انعام میں محبوب کی مراد اپنی مراد کے ساتھ ملی جلی ہوتی ہے اور جلال و ایلام میں خالص محبوب ہی کی مراد ہے اور اپنی مراد کے برخلاف ہے، "شتان بینهما"[1] اس کے قلب کی کشش دائمی طور پر محبوب ہی کی طرف ہوتی ہے دنیا و آخرت کی نعمتوں سے اس کا دل رہا ہو جاتا ہے۔ اس کو تمام احوال و مشاہدات سے یکسوئی و بے نیازی حاصل ہو جاتی ہے، حق تعالیٰ ہی سے دائمی آرام و آگاہی حاصل ہو جاتی ہے، اسی کو 'قرب' و 'اتصال' وصال سے تعبیر کیا جاتا ہے!

گشتہ ام در جہاں و آخر کار
دلبرے برگزیدہ ام کہ مپرس (حافظ)

دوسرے الفاظ میں اس حالت قلبی کو "فقر" سے تعبیر کیا جاتا ہے، جس پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فخر کیا ہے "الفقر فخری" 'فقر' میں قبلۂ توجہ حق تعالیٰ کے سوا کوئی چیز نہیں ہوتی، اسی فقر سے "غنا" پیدا ہوتی ہے، جو حق سے کامل نیاز پیدا ہو جانے کی وجہ سے خلق سے بے نیاز ہو جانے کا نام ہے!

آنکس کہ ترا شناخت جاں را چہ کند	فرزند و عیال و خانماں را چہ کند
دیوانہ کنی ہر دو جہانش بخشی!	دیوانۂ تو ہر دو جہاں را چہ کند

یہ حال تو منتہیوں کا ہے، ان کی نظر ذات بحت پر ہوتی ہے، ان کا قلب ماسوا اللہ سے فارغ و خالی ہوتا ہے، مقصود و مطلوب بجز واحد مطلق کے کچھ نہیں رہتا، تمام مقاصد ان کے سینہ سے نکل جاتے ہیں، اور ان کی ساری ہمت حق تعالیٰ کی رضامندی کے حصول میں صرف ہوتی ہے! زندگی کا مقصد ان کے نزدیک بس یہی ہے اور اسی طرف خلق کو وہ بلاتے ہیں۔

[1] مجدد الف ثانی جلد سوم مکتوب ۶

سررشتہ دولت اے برادر بکف آر — دیں عمر گرامی بہ خسارت مگذار

دائم ہمہ جا با ہمہ کس در ہمہ کار — می دار نہفتہ چشم دل جانب یار!

بتدیوں کا حال اس کی بالکل ضد ہے! یہ اپنے خدا کو زندگی کے مصائب سے نجات پانے کے لیے استعمال کرتے ہیں، گویا کہ وہ ان کی خواہشوں اور تمناؤں کے پورا کرنے کا ایک آلہ ہے، وہ اپنے مقاصد کے حصول کے لیے اس سے دعا کرتے ہیں، ان کا مطلوب و محبوب ان کی اپنی تمنائیں ہیں، ان کا سینہ ان کی اپنی خواہشوں اور آرزوؤں سے بھرا ہوتا ہے، ہر خواہش پر ان کا دم نکلتا ہے، تلخیوں سے ان کا دل پرخون ہوتا ہے، دراصل یہی آرزو و ارمان ان کے معبود ہیں! مصائب میں گرفتار ہونے کے بعد خوف و حزن لوازم قلب ہو جاتے ہیں، ان سے جب یہ کہا جاتا ہے کہ اپنے سینے سے مقاصد کی نفی کرو اور قلب کی توجہ کو حق تعالیٰ پر مرکوز کرو، اپنے مصائب سے نظر اٹھاؤ اور حق تعالیٰ پر اس کو قائم رکھو کہ یہی راحتِ جان کے حصول کا واحد طریقہ ہے،

مکن رغبت بچیزے ورنہ حالت بے صفا گردد

برغبت انچہ خواہی عاقبت بر جان بلا گردد

بات تو ان کی سمجھ میں آتی ہے لیکن اس پر عمل ان کے لیے ناممکن سا معلوم ہوتا ہے، لیکن یہ ناممکن نہیں، اس کا آسان طریقہ ہم تبلاتے ہیں اور وہ یہ ہے: مصائب کے نزول کے وقت تجریدی طور پر خدا کی طرف توجہ واقعی ابتدا میں مشکل ہے، ایسے وقت قرآن کریم کی آیت پر توجہ مرکوز کی جا سکتی ہے، مثلاً اس آیت کو لیجیے:

وَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ فَإِنَّكَ بِأَعْيُنِنَا — اپنے رب کے حکم پر صبر کر کیونکہ تو ہماری آنکھوں کے سامنے ہی تو ہے!

اس آیت کے مفہوم کو سمجھ کر کہ حق تعالیٰ ہماری حالت سے واقف ہیں، ہم ان کی نگاہوں کے سامنے ہیں، اور جو خنجر دوست پر قربان ہو جاتا ہے، وہ سر سے لیکر پیر تک جان ہی جان ہو جاتا ہے، ہم اس آیت کی تکرار کرتے جائیں تو ہمارا دلِ شوریدہ رفتہ رفتہ ساکن و مطمئن ہوتا جاتا ہے اور روح کو بتدریج روشنی و فہم عطا کی جاتی ہے، یہاں تک کہ ہمیں یہ یقین ہونے لگتا ہے کہ سب کچھ ٹھیک ہے اب بھی اور ایک کرور سال بعد بھی!

مبتدی کی یہ بات گو سمجھ میں نہ آئے لیکن اس میں ذرا بھی شک نہیں کہ ہمارا کام نزول بلا کے وقت صرف اتنا ہے کہ قلب کو حق تعالیٰ سے مربوط کر لیں، اور اس طریقہ سے سکینت و اطمینان حاصل کرنے کی کوشش کریں! مصیبت خواہ کتنی ہی بڑی ہو، قلب کی سنبھال اصل چیز ہے! کل ہمیں سولی ہی دیجانے والی ہو، ہمیں آج صرف اتنا ہی کرنا ہے کہ قلب کی وسعتوں میں حق تعالیٰ کو گھیر لیں اور ان کے سوا کسی اور کی جگہ نہ چھوڑیں،

در دل بجز یکے نشاید کہ بود — در خانہ اگر ہزار باشد شاید!

اس کا طریقہ ابتدا میں یہی ہے کہ کسی موزوں آیت پر توجہ کو پوری قوت سے مرکوز کر دیں، ابتدا میں ہمیں معلوم ہوگا کہ ہمارا قلب گویا ایک مینا بازار ہے، جس میں شور و غوغا، چیخ و پکار کے سوا کچھ نہیں! ہمیں اس سے بچ نکلنا ناممکن معلوم ہوگا، لیکن اگر ہم آیت کریمہ کی تکرار کرتے جائیں تو رفتہ رفتہ شور میں کمی ہوتی جائے گی، ہمیں ہمت و استقلال سے کام لینا ہوگا، کیونکہ جوں ہی خیال آیت پر جمنے لگے گا پھر مصیبت کا تصور ہمیں پریشان کرنے لگے گا اور ہمیں پھر شروع سے کوشش کرنی پڑیگی، ایسا معلوم ہوگا کہ گویا ہم ایک عمیق غار میں ہیں، جس کی تمام دیواریں چکنی اور پھسلنی ہیں، ہم اوپر چڑھنے کی کوشش کر رہے ہیں اور پھسل کر نیچے گر رہے ہیں، گھڑی گھڑی چڑھ رہے ہیں اور بار بار پھسل کر گر رہے ہیں، بہرحال ہمت و استقامت کی آخر میں جیت ہوگی، اور ہمیں معلوم ہوگا کہ توجہ آیت پر جم رہی ہے، اور خدا کی طرف نظر اٹھ رہی ہے، اور سکون و اطمینان کی ایک لہر باطنِ قلب سے سر اٹھا رہی ہے!

اس حالت یا مقام پر پہنچنے کے بعد ہماری تمنا صرف یہ ہوگی کہ حق تعالیٰ وہی کریں جسمیں ہماری خیر ہو،

ماکارِ خود بیارِ گرامی گزاشتیم !!

گر زندہ سازد، ور کشد رائے او دوست !

اور ہماری زبان سے بے اختیار نکلے گا!

اللھم خرلی واخلق لی ولا تکلنی الی اختیاری !

رسول کریمؐ نے ہمیں یہ دعا سکھلائی ہے کہ اللھم لا تکلنی الیٰ نفسی طرفۃ عین او اقل من ذالک" ! مولیٰ ہمیں ایک لحظہ کے لیے یا اس سے بھی کم عرصہ کیلیے ہمارے اپنے نفس اور اس کی تمناؤں کے حوالہ نہ کر" ! ہمیں اپنی تمناؤں کی تکمیل کی کوشش کے بجائے اور زندگی کے معاملات کو اپنی رائے کے مطابق سنوارنے کے بجائے رضائے حق کا طالب بنجانا چاہیے، احکام شریعت کی رعایت اور اخلاص و توجہ بحق کا دوام ہی ہماری دولت ہے، ع

ایں داشتہ باش گو دگر ہیچ مباش !

تو چوں گوئی دریں میداں بیندیش	کجا خواہی رسید از کوشش خویش
برو تسلیم چوں گان شو زمانے	مگر یابی ز حال خود نشانے

بہت سے لوگ ایسے بھی نظر آئے جو زندگی کی کسی تکلیف کو دور کرنے کے لیے برسوں درد و رقت کے ساتھ دعائیں کرتے رہے، آخر میں تھک کر اور "سرِ تسلیم خم ہے جو مزاجِ یار میں آئے" کہہ کر انھوں نے رضا بالعطا اختیار کیا، فوراً ہی ان کے حالات میں ایک ایسا تغیر پیدا ہوا جو ان کی آرزوؤں و تمناؤں سے بھی زیادہ بہتر تھا، معلوم ہوتا ہے کہ ان کی دعائیں مرضی حق کے مطابق نہ تھیں اور انھوں نے کبھی قلب کی گہرائیوں سے نہیں کہا تھا

رَضِیْتُ بِاللّٰہِ رَبًّا	میں اللہ کی ربوبیت سے راضی ہوں

انھوں نے ربوبیت کے بوجھ کو اپنے ہی کمزور کاندھوں پر اٹھا لیا تھا، اور اپنے کاموں کے خود رب بن گئے تھے، اور جب بالآخر انھوں نے محسوس کیا کہ اس سے تو کام نہیں چلتا اور

من بدستِ دوست دادم اختیارِ خویش را

کہہ کر انھوں نے توافق بالقضاءً پر اپنے نفس کو آمادہ کر لیا، اور

بگزاشتہ ام مصلحت خویش بدو	گر بکشد ور زندہ کند او داند

کہہ کر حضرت کریم سے تقاضا چھوڑ کر حسن ظن سے کام لینا شروع کر دیا تو ان کی ساری الجھنیں سلجھ گئیں، اسی لیے تو کسی عارف نے کہا تھا کہ :

"سالک را دو حال باید یکے سوختن بے تکلف، دیگرے ساختن بے تصرف، کما قیل

کمال عاشقی پروانہ دارد

کہ جز از سوختن پروانہ دارد

ہمیں نہ کسی سے لڑنا ہے نہ جھگڑنا، ہمیں صرف جاننا ہے کہ یہ جاننا ہے کہ اس کائنات کے حوادث یومیہ واجب الوجود جل شانہ کے ارادہ سے پیدا ہوتے ہیں اور اسی کے فعل سے ظہور پذیر ہوتے ہیں لہٰذا اپنے ارادے کو حق تعالیٰ کے ارادے کے تابع بنا کر ان حوادث کو اپنی مرادیں سمجھنا چاہیے اور ان سے لذت حاصل کرنی چاہیے، اگر بندگی ہے تو یہ نسبت ضرور پیدا کرنی چاہیے، ورنہ بندگی سے پاؤں نکالنا اور اپنے مولیٰ جل شانہٗ سے مقابلہ کرنا ہے، حدیث قدسی میں آیا ہے

من لم یرض بقضائی ولم یصبر	جو میری قضا سے راضی نہیں اور میری بلا پہ صبر
علی بلائی فلیطلب ربا سوائی	نہیں کرتا وہ میرے سوا کسی اور رب کو پیدا کر لے
ویخرج من تحت سمائی [1]	اور میرے آسمان کے نیچے سے نکل جائے،

---

[1] مکتوبات مجدد الف ثانی، ج ۳ مکتوب ۵۹

ہماری زندگی ایک روحانی کائنات میں بسر ہو رہی ہے، روحانی قوانین کے یہ زیر تصرف و حکم رانی ہے،
روحانی قوتیں اس کو چلا رہی ہیں، تمام حوادث حق تعالیٰ ہی کے فعل سے ظہور پذیر ہو رہے ہیں، ہر تجربہ میں
حق تعالیٰ ہمارے ساتھ ہیں، ہمیں صرف یہ کرنا ہے کہ اپنے ارادے کو حق تعالیٰ کے ارادے کے تابع بنا کر، نظر
ان کے فعل پر جما کر، قلب کو ساکن و مطمئن رکھیں اور لذت دید سے محظوظ ہوتے رہیں، غم و الم ہوائے نفس
سے ہمیں خالی کرنے، ہمارے ارادے کو ارادۂ حق میں تبدیل کرنے آتے ہیں، ان تلخیوں کا مقصود ہمارے
قلب سے ساری تلخیوں کو دور کرنا ہوتا ہے، اس راز کو ایک عاشق شیدا اپنے الفاظ میں حق تعالیٰ
کی زبان سے یوں ادا کرتا ہے:

من ترا غمگین و ہم گریاں کنم — تا کت از چشم بدت پنہاں کنم
از آں نجو شانم کہ مکروہ نئی — بلکہ تا گیری تو ذوقِ چاشنی
زاں حدیث تلخ می گویم ترا — تا ز تلخیہا فرو شویم ترا
تو ز تلخی چوں ہمہ پر خوں شوی — پس ز تلخیہا ہمہ بیروں شوی

اس ساری گفتگو کا کوئی یہ مطلب نہ سمجھ لے کہ ہمیں اپنے فرائض زندگی کی ادائی میں جد و جہد
نہیں کرنی چاہیے، تعطل کی زندگی بسر کرنی چاہیے، نہیں، یہاں تعطل حرام ہے" العطلۃ حرام"
ہمیں مردانہ وار قدم اٹھانا چاہیے، زندگی کے تمام فرائض کو جرأت و استقلال سے ادا کرنا چاہیے"

شیر شو شیرانہ در صحرائے شیراں پائے نہ
مرد شو مردانہ پندِ ناصحاں را گوش گیر

ہمیں مجاہدانہ زندگی بسر کرنی چاہیے، لیکن اسی دوران میں ہمیں معلوم ہو جاتا ہے کہ ہمیں صحیح قوت
سے صحیح مقام تک پہنچایا جا رہا ہے"، اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ واقعات کچھ ایسے مل جل کر کام کر رہے
ہیں کہ انجام تعجب خیز طریقہ پر اچھا ہو رہا ہے، صاف طور پر نظر آنے لگتا ہے کہ حق تعالیٰ کا دستِ کرم

ہماری رہبری کر رہا ہے، وہ حالات میں ترتیب و تطابق پیدا کر رہے ہیں، خار خشک بھی گلِ تر
ہوتا جاتا ہے، اس حالت میں ہم عقل معاش کے پرستاروں سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں

دل اندر زلف لیلیٰ بند و کار از عقل مجنوں کن
کہ عاشق را زیاں دارد مقالات خرد مندی

قُلْ هُوَ الرَّحْمٰنُ اٰمَنَّا بِهٖ وَعَلَيْهِ تَوَكَّلْنَا ۚ فَسَتَعْلَمُوْنَ مَنْ هُوَ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ (الملک)

تلخیص و تبصرہ

ہندوستان کے مغل بادشاہوں کا نظام عدل

ڈاکٹر پی، سرن ایم، اے، پی، ایچ، ڈی (ہندو یونیورسٹی، بنارس) نے اپنی کتاب "مغلوں کی صوبائی حکومت" میں ایک باب "قانون، عدل، پولیس اور جیل" کے عنوان سے بھی لکھا ہے، ذیل میں اس کے کچھ اقتباسات پیش کیے جاتے ہیں:

مغلوں کے زمانے میں عدل کا عام نظام تین افراد پر خاص طور پر مشتمل تھا، بادشاہ صدر اور دیوان اعلیٰ، بادشاہ وقت کے بعد محکمۂ عدل و انصاف کا سب سے بڑا عہدہ دار صدر ہوتا تھا، وہ قاضی القضاۃ کے فرائض بھی ادا کرتا تھا، اس کے فرائض کی ادائیگی میں دیوان اعلیٰ مدد دیا کرتا تھا، مفتی کا ذکر برابر آتا ہے، مگر یہ کوئی سرکاری عہدہ نہ تھا، بلکہ وہ غیر سرکاری طور پر فتوے دیا کرتا تھا، صدر کے پاس جب کاموں کی زیادتی ہو جاتی تھی تو وہ میر عدل کا تقرر کرکے کام کا بار ہلکا کرتا تھا، لشکر کے ساتھ جو قاضی ہوتے تھے، وہ بھی میر عدل کہلاتے تھے،

سرکار کا نظام عدل عام طور سے علاقے، صوبے، سرکار اور پرگنوں میں منقسم تھے، ہر سرکار کے نظم و نسق کے لیے چار عہدیدار ہوتے تھے، فوجدار، کوتوال، عامل اور قاضی، فوجدار اس کی نگرانی کرتا تھا، کہ قانون کی پابندی ہو رہی ہے، امن قائم ہے، سرکاری حکام اپنے فرائض صحیح طور پر انجام دے رہے ہیں، اور کہیں فتنہ و فساد کا تو احتمال نہیں ہے، وہ بادشاہ وقت کے

تمام احکام کو نافذ کراتا، لیکن اس کا محکمۂ عدل و انصاف سے کوئی تعلق نہ ہوتا تھا، کوتوال کی حیثیت مجسٹریٹ، پولیس کے سربراہ اور بلدیہ کے صدر کی ہوتی تھی، سرکار میں جو جرائم ہوتے، ان کے مقدمات اسی کے پاس ہوتے، کوتوال اور قاضی کی عدالتوں کے مقدموں کی تصریح تو نہیں ملتی لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ غیر مذہبی مقدمے کوتوال کے سامنے پیش ہوتے تھے، اور مذہبی شرعی معاملات مثلاً نکاح، طلاق، وراثت، یا شہری جھگڑے کے مقدمات قاضی کی عدالت میں طے ہوتے، عدل و انصاف کا محکمہ کوتوال اور قاضی دونوں کے ذمہ ہوتا تھا، عامل بھی ان دونوں سے تعاون کرتا تھا، کیونکہ رہزنوں، چوروں اور فسادیوں کو اسی کے ذریعہ سزا ملتی تھی، کوتوال کی کچہری چبوترہ کہلاتی تھی، اورنگ زیب نے اپنے حکام کے لیے جو ہدایات جاری کی تھیں، ان میں کوتوال کو خاص طور پر اس کی تاکید تھی کہ وہ تمام جھگڑوں کی نگرانی خود کرے، جس کا تعلق شرعی مسائل سے ہو، اس کو قاضی کے پاس بھیجدیا جائے، اگر مال سے متعلق ہو تو صوبہ دار کے سامنے پیش کیا جائے، اسی سلسلہ میں ایک فرنگی سیاح منریق نے یہ دلچسپ واقعہ لکھا ہے کہ وہ اپنے چند ساتھیوں کے ہمراہ کشتی کے ذریعہ ہگلی کے ذریعہ گور جا رہا تھا، ایک گاؤں کے کچھ لوگ ان کو دریائی قزاق سمجھے، کیونکہ چاٹگام کے کچھ فرنگی بحری لیٹروں نے غارت گری کرکے اس علاقہ میں دہشت پھیلا رکھی تھی، اس لیے منریق اور اس کے ساتھی گرفتار کرکے قید کر دیے گیے، گاؤں کے شقدار کو ان کے مقدمہ کے فیصلہ کا اختیار نہ تھا، اس لیے اس نے اس کی روداد لکھ کر ان کو محافظوں کی نگرانی میں مدناپور کے کوتوال کے پاس بھیجدیا، وہاں انکا مقدمہ پیش ہوا، اور وہ بری کر دیے گئے،

پرگنہ کی عدالت پرگنہ میں عدل و انصاف کی نگرانی قاضی کیا کرتا تھا، اس کے سامنے شرعی اور شہری دونوں قسم کے قضیے پیش ہوتے تھے، شقدار پرگنہ میں فوجدار اور کوتوال کی طرح نظم و نسق

قائم رکھنے کا ذمہ دار ہوتا تھا، اگر کوئی غیر مذہبی مقدمہ ہوتا تو شقہ دار اس کا بھی فیصلہ کرتا تھا، منریق
نے اس سلسلہ میں بھی عجیب و غریب واقعہ ذکر کیا ہے، وہ ایک رات سرکار نراین پور (بنگال) کے
ایک گاؤں میں مقیم تھا، اس کے ایک ساتھی نے گاؤں کے کسی آدمی کے دو پالتو مور مار ڈالے، ہندوں
نے شقہ دار کے پاس جا کر شکایت کی، اس نے مجرم کو پکڑ منگوایا، منریق نے اس کی صفائی میں
بہت کچھ کہا اور سفارش بھی کرائی، لیکن اس کو سزا دی گئی، ایسے جرم کی سزا تو ہاتھ کاٹ دینے کی
تھی، مگر منریق کی کوشش سے مجرم کا ہاتھ تو نہیں کاٹا گیا، مگر کوڑے لگائے گئے، گاؤں کی حفاظت
کے لیے پرگنے میں مختلف تھانیدار مقرر ہوتے تھے، مگر ان کو مقدمات کے فیصلہ کا اختیار نہ تھا، ہر قصبہ
بلکہ ہر بڑے گاؤں میں ایک قاضی بھی رہتا تھا، ضلع کا علیحدہ قاضی ہوتا تھا جو ضرورت کے مطابق
اپنا مددگار مقرر کر دیتا تھا، مثلاً اکبر کے عہد میں بھی ضلع بھاگلپور (بہار) میں بھاگلپور، کہل گاؤں،
بیہپور اور گوگری میں چار نائب تھے، پھر بھاگلپور کے نائب کے ماتحت پانچ نائب اور کہلگاؤں،
بیہپور اور گوگری کے نائب کی نگرانی میں تین تین قاضی تھے، اس طرح ایک ضلع میں ۱۹ قاضی
مختلف مقامات میں متعین تھے۔

مغل حکمرانوں کی عدل پسندی

مغل بادشاہوں نے اپنے نظام عدل سے عوام کو پورے طور سے
مطمئن کر رکھا تھا، وہ دیوان عام میں عوام کی شکایتوں کو سنتے، اور انصاف کرنے کی خاطر
روزانہ دربار منعقد کرتے، انصاف کا طریقہ اتنا آسان تھا کہ ادنیٰ سا ادنیٰ آدمی بادشاہ کے
پاس آسانی سے پہنچ سکتا تھا، جو بھی چاہتا دربار عام کے سامنے حاضر ہو کر خود اپنا استغاثہ پیش کر دیتا،
دربار کے عہدیدار اس کو لیکر بادشاہ کے سامنے پیش کر دیتے، بادشاہ اس پڑھوا کر سنتا، مدعی سے
جرح کرتا، اور پھر مناسب کارروائی کے لیے فیصلہ صادر کر دیتا، ابوالفضل کا بیان ہے کہ اکبر
نے روزانہ ۱½ پہر عدل و انصاف کے لیے وقت مقرر کر رکھا تھا، جہانگیر اور بھی سخت تھا، وہ دو گھنٹے

روزانہ عوام کی شکایتیں سنتا تھا، اس نے تو اپنے محل میں ایک زنجیر لگا رکھی تھی، تاکہ ہر شخص کسی
روک ٹوک کے بغیر براہ راست اس سے فریاد کر سکے، اور یہ عدل پسندی میں اس کے اخلاص
کی دلیل تھی، وہ اپنے تیرہویں سال جلوس میں جب احمد آباد گیا تو اس کا لحاظ خاص طور پر رکھا کہ
شاہی لشکر کا کوئی فرد وہاں کے باشندوں پر ظلم نہ کرنے پائے، چنانچہ روزانہ تین گھنٹے جھروکہ میں
بیٹھکر مظلوم کی فریاد سنتا اور ظالموں کو سزا دیتا تھا، احمد آباد میں وہ علیل ہو گیا تھا لیکن علالت کے
زمانہ میں بھی جھروکہ کی نشست ختم نہیں کی، وہ ایسے موقع پر جسمانی راحت کو حرام سمجھتا تھا،

اہم مقدمات کی سماعت کے لیے ہفتہ میں ایک دن مقرر تھا، اکبر ایسے مقدمات
جمعرات کو، جہانگیر منگل کو اور شاہ جہاں بدھ کو سنا کرتا تھا، یہ عدالت دیوان خانۂ خاص میں
منعقد ہوتی تھی اور وہاں صرف متصدیانِ عدالت، مفتی، فقہا، علما، یا بعض امراء طلب کیے
جاتے تھے، برنیر نے بھی مغلوں کے عدل و انصاف کی تعریف کی ہے،

جب مغل بادشاہ سفر یا کسی مہم میں ہوتے، اسوقت بھی ان کی عدالت برابر منعقد ہوتی
رہتی تھی، جب ان کا لشکر کوچ کرتا تھا، تو اس کی نگہداشت بھی کرتے تھے کہ کسی کاشتکار کی
کھیتی کو کوئی نقصان نہ پہنچنے پائے، شاہ جہاں ایسے موقع پر کھیتوں کی حفاظت کے لیے
عہدیدار مقرر کر دیتا تھا، اور اگر کسی کی کھیتی کو نقصان پہنچ جاتا تو اس کی سماعت کے لیے
ایک خاص عدالت طلب کی جاتی،

اپیل

مقدمہ کی اپیل کیلیے موجودہ دور کے طریقے تو نہ تھے لیکن اس سے عدل و انصاف میں کوئی رکاوٹ پیدا
نہیں ہونے پاتی تھی، ماتحت عدالتوں سے اوپر کی عدالتوں میں مقدمے لے جانے کی
اجازت تھی، پھر بادشاہ وقت تک رسائی بھی آسان تھی، مال کے مقدمے سرکار اور
پرگنوں میں قاضی کے یہاں طے ہوتے تھے لیکن ان کی اپیل کی سماعت دیوان صوبہ اور دیوان اعلیٰ

کے یہاں ہوتی تھی، سرکار اور اس سے نیچی عدالتوں میں ایسے دیوانی اور فوجداری کے مقدمات کا فیصلہ جن کا تعلق مذہب سے ہوتا تھا، قاضی ہی صادر کرتا، لیکن ان کی اپیل صوبہ کے صدر، قاضی یا میر عدل اور پھر وہاں سے صدر الصدور کے یہاں ہو سکتی تھی، پرگنے میں چھوٹے چھوٹے جرائم کے مقدمے شقدار ہی طے کر دیتا تھا، مگر اس کی اپیل سرکار میں کوتوال کے یہاں ہوتی رہتی تھی، پھر اس سے اوپر ناظم صوبہ اور بادشاہ کے یہاں بھی مدعیوں کو اپیل کرنے کا اختیار تھا، بعض پرگنے اقتصادی اور سیاسی حیثیت سے اتنے بڑے ہوتے کہ ان کی اہمیت سرکار سے کم نہ ہوتی تھی، اس لیے ان کی عدالتیں صوبہ کے صدر کے ماتحت ہوتی تھیں، اور ان کی حیثیت سرکار کی عدالتوں کے برابر ہی ہوتی تھی،

بعض اوقات جب ان کارروائیوں کی پابندی نہ ہوتی تو ناظم صوبہ مداخلت کرتا، لب التواریخ کے مؤلف کا بیان ہے کہ مجرم جہاں گرفتار ہوتا، پہلے وہاں کی مقامی عدالت میں پیش کیا جاتا، اور اگر کوئی شخص کسی فیصلہ سے مطمئن نہ ہوتا، تو وہ ناظم صوبہ یا قاضی دیوان صوبہ کے یہاں اپیل کرتا، جہاں مقدمہ کی تفتیش اور سماعت بڑی احتیاط اور توجہ سے کیجاتی، کیونکہ ہر شخص کو خوف یہ رہتا کہ کہیں بادشاہ تک یہ خبر نہ پہنچے کہ انصاف کرنے میں کوتاہی ہوئی، اگر فریقین پھر بھی مطمئن نہ ہوتے تو وہ دیوان اعلیٰ کے یہاں اپیل کرتے، اگر شرعی مقدمہ ہوتا تو اس کی اپیل قاضی القضاۃ کے پاس ہوتی، یہ دونوں پوری سرگرمی سے مقدمے کی تفتیش کرتے، اگر مقدمے مشکل ہوتے تو بادشاہ وقت کے پاس بھیج دیے جاتے، ٹیورنیر نے بھی ایسی اپیل کا ذکر کیا ہے، احمد آباد کی ایک بیوہ بڑی متمول تھی، اسکے رشتہ دار اس کی جائداد پر قبضہ کرنا چاہتے تھے، اس لیے انھوں نے یہ کوشش کی کہ اسکے ایک نوزائیدہ لڑکے کو جو اپنے باپ کی وفات کے بعد پیدا ہوا تھا، ناجائز ثابت کر دیں، چنانچہ انھوں نے بیوہ کو بہت تنگ کیا، تو اس نے احمد آباد کے ناظم کے پاس فریاد کی، ناظم نے اطباء کو بلا کر مشورہ کیا، انھوں نے بیوہ کی موافقت میں رائے دی، اور ناظم کی جائداد کا وارث نوزائیدہ بچہ ہی کو قرار دیا،

لیکن بیوہ کے رشتہ دار مطمئن نہیں ہوئے، اور انھوں نے آگرہ بادشاہ کے یہاں اپیل کی، بادشاہ نے بیوہ اور بچہ دونوں کو طلب کیا، یہ پوری کارروائی ہونے کے بعد ناظم صوبہ کا فیصلہ صحیح قرار دیا گیا، اس طرح بیوہ اپنے حریص رشتہ داروں کے ظالم پنجوں سے بچ گئی،

جہانگیر نے بھی اسیطرح کے ایک واقعہ ذکر کیا ہے، ایک شخص عبد الوہاب بن حکیم علی نے لاہور کے کچھ سادات کے خلاف اسّی ہزار روپئے کا جھوٹا دعویٰ دائر کیا، اور اس کے ثبوت میں ایک دستخط شدہ کاغذ اور کچھ گواہ بھی پیش کر دیے، لیکن سادات لاہور نے اس کاغذ کو بالکل جعلی بتلایا، مدعی حلفیہ بیان دینے کے لیے تیار ہو گیا، قاضی اور صدر دونوں کو اس کا بیان مشکوک معلوم ہوا، انھوں نے جہانگیر کے پاس یہ مقدمہ بھیجدینا چاہا، جہانگیر نے پہلے تو کہلا بھیجا کہ ضروری شہادتیں لیکر اس کا فیصلہ کر دیا جائے، لیکن جب معتمد خاں لاہور کے سادات سے ملا تو اس نے جہانگیر سے کہا کہ اس مقدمہ میں خاص شاہی توجہ کی ضرورت ہے، جہانگیر نے آصف خاں کو اسکی تفتیش کے لیے مامور کیا، جب آصف خاں نے فریقین کو طلب کیا تو عبد الوہاب کے ہوش وحواس خطا ہو گئے، اس نے سادات لاہور کو آصف خاں کے پاس جانے سے روکا اور مقدمہ اٹھا لینے کا وعدہ کیا، لیکن آصف خاں نے اس کو زبردستی پکڑوا بلایا، اس وقت اس نے اعتراف کیا کہ اس کا دعویٰ جھوٹا ہے، اس کی سزا میں عبد الوہاب سے شاہی جاگیر اور منصب چھین لیا گیا، اور سادات لاہور بری کر دیے گئے،

پنچایتی نظام

عدل وانصاف کا جو نظام تھا، اور اس کی جو سہولتیں حاصل تھیں، اس کی وجہ سے مقدمات کی تعداد زیادہ نہیں ہونے پاتی تھی، اس کی ایک بڑی وجہ یہ بھی تھی کہ گاؤں کا پنچایتی نظام بدستور سابق قائم رکھا گیا تھا، برطانوی عہد کے حکام نے بھی اس کی تصدیق کی ہے کہ گاؤں میں انیسویں صدی عیسوی تک پنچایتی عدالتیں برابر کام کرتی تھیں، چھوٹے چھوٹے قضیے ان ہی

عدالتوں میں طے پاجاتے تھے، اس لیے آج کل کی طرح بڑی عدالتوں میں مقدمات کا انبار نہ لگنے پاتا تھا، گاؤں کی پنچایتوں میں پوری دیانت اور غیر جانبداری سے جھگڑے چکا دیے جاتے اور فریقین کو مالی تباہی میں مبتلا نہ ہونا پڑتا، گو ان کو اس کا پورا اختیار تھا کہ وہ اپنے مقدمات کی اپیل اونچی عدالتوں میں کریں،

مقدمات کی کمی کی دوسری وجہ یہ بھی تھی کہ انکا فیصلہ جلد سے جلد کر دیا جاتا تھا، اور پرگنوں کی عدالتوں میں جو مقدمات پیش ہوتے ان کے لیے فریقین کو لامتناہی مدت تک انتظار نہ کرنا پڑتا تھا،

عدل نوازی کی عملی مثالیں

مغل بادشاہ منصفانہ فیصلے کرنے میں بہت سخت تھے، اگر مجرم کوئی بڑا عہدیدار یا بادشاہ کا رشتہ دار بھی ہوتا تو بھی اس کو سخت سے سخت سزا دینے میں تامل نہ کیا جاتا تھا، اور غلط قسم کے وقار اور رعب کو انصاف میں حائل ہونے نہیں دیا جاتا، اور ہر حالت میں حکومت کی نیک نامی کا لحاظ رکھا جاتا تھا، مغل حکمراں عوام کا اعتماد حاصل کرکے اپنا وقار قائم کرنا زیادہ بہتر سمجھتے تھے، وہ بیجا رعب بٹھانے کے قائل نہ تھے، ان کو جب کبھی کسی حاکم کے ظلم اور غیر منصفانہ رویہ کی خبر ملتی تو اس کو سخت سزا دینے میں مطلق تامل نہ کرتے، تمام مغلیہ سلاطین کا یہی طریقہ رہا، پادری مونسریٹ نے عہد اکبری کا حال لکھا ہے کہ جب کوئی حاکم غلطی یا بری مثال پیش کرتا تو بادشاہ اس سے پورا مواخذہ کرتا، جن باتوں سے عوام کے اعتماد کو نقصان پہنچتا ان کے انسداد میں بادشاہ کوئی رو رعایت نہ کرتا، اس لیے تمام حکام اس کی سختی سے خوف زدہ رہتے، اور اس کے حکم کی تعمیل پوری تندہی سے کرتے، بادشاہ کو انصاف اور عوام کے حقوق کا بڑا لحاظ تھا، اگرچہ جہانگیر اور شاہجہاں نے حکومت کے نظم و نسق میں اکبر کی جیسی مستعدی ظاہر نہیں کی لیکن عدل پروری میں کسی قسم کی کمی نہیں کی، اس میں شک نہیں کہ

اچھی سے اچھی حکومتوں میں بھی بے انصافی اور بد معاملگی کی مثالیں پائی جاتی ہیں، کوئی حکومت برائیوں کا پورا استیصال نہیں کر سکتی لیکن مغلوں کے عہد میں جب نظم و نسق میں کچھ انتشار بھی پیدا ہو گیا تھا، اس وقت بھی عوام کے مفاد کی پوری نگہداشت کی گئی، اس کی شہادت ملکی اور غیر ملکی اہل قلم کی تحریروں سے ملتی ہے، ۱۵۸۵ء میں حاجی ابراہیم سرہندی گجرات کا صدر اور قاضی تھا، احمد آباد کے لوگوں نے اس کے خلاف درخواست دی، ملا عبد القادر بدایونی کا بیان ہے کہ حاجی رشوتیں لیا کرتا تھا، جب اس کی تفتیش کی گئی اور جرم صحیح ثابت ہو گیا تو قاضی کو نہ صرف برطرف بلکہ رنتھنبور کے قلعہ میں قید بھی کر دیا گیا، اکبر ہی کے عہد میں سید سلطان تھانیسر کا کروری مقرر ہوا، اس نے وہاں بڑے مظالم ڈھائے، تو اس کو موت کی سزا دی گئی، منزریق کا واقعہ اوپر لکھا جا چکا ہے، اس کی تفصیل یہ ہے کہ وہ اڑیسہ میں جالیسر سے نرائن گڑھ جا رہا تھا کہ ایک گاؤں میں اس کے ایک ساتھی نے دو مور مار ڈالے، منزریق کے تمام ساتھی گرفتار کر لیے گئے، اور جب مجرم شقہ دار کے پاس پیش کیا گیا تو شقہ دار نے اس سے پوچھا کہ اس کو ہندوؤں کے گاؤں میں جاندار چیز مار ڈالنے کی جرأت کیسے ہوئی؟ شقہ دار مسلمان تھا، اس لیے منزریق نے یہ کہکر متاثر کرنا چاہا کہ اسلام میں جانوروں کو مارنے کی ممانعت نہیں ہے، شقہ دار نے جواب دیا کہ یہ صحیح ہے لیکن ہمارے بادشاہ نے جب اس علاقہ کو فتح کیا تو وعدہ کیا تھا کہ وہ اور اس کے جانشین یہاں کے لوگوں کو ان کے قوانین اور مراسم کے مطابق زندگی بسر کرنے دینگے، اس لیے وہ کسی قسم کی وعدہ شکنی پسند نہیں کر سکتا، شقہ دار نے منزریق سے سزا کو ہلکا کر دینے کا وعدہ کیا، بشرطیکہ مدعی بھی راضی ہو جائے، کیونکہ وہ مدعی کو ناراض کرنا پسند نہیں کرتا تھا، اس جرم کی سزا ہاتھ کاٹ دینے کی سزا تھی، شقہ دار نے صرف انگلیاں کاٹ دینے کا حکم دیا، لیکن منزریق نے اس سزا کی بھی عذر داری کی، بالآخر مدعی کی خواہش پر مجرم کو اس کے سامنے کوڑے لگوا کر بری کر دیا گیا، اس واقعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ دار السلطنت سے

دور دراز مقامات میں بھی رائے عامہ کا کس طرح لحاظ رکھا جاتا تھا، پایہ تخت کے قرب وجوار میں تو اور بھی حالات اطمینان بخش رہے ہوں گے، جہانگیر اور شاہ جہاں نے کبھی کبھی غیر روادارانہ پالیسی ضرور اختیار کی، لیکن انھوں نے عوام کی روایات کا لحاظ برابر رکھا، اور پھر وہ ان کے مطالبات کے سامنے جھکتے بھی رہے، شاہ جہاں نے بنگال کے ناظم کو محض اس لیے عہدہ سے علٰحدہ کر دیا کہ وہاں کے لوگوں نے اس کے خلاف شکایتیں کیں، لیکن جب تفتیش ہوئی تو یہ شکایتیں بے بنیاد ثابت ہوئیں، اسلیے فدائی خاں کو بنگال کی نظامت پھر تفویض کر دی گئی، گجرات کے ناظم (۵۲-۱۶۴۸ء) حافظ محمد نصیر کو پٹنہ میں حبس دوام کی سزا دی گئی، کیونکہ بعض تاجروں نے اس کے خلاف شکایتیں کیں جو تحقیقات کے بعد صحیح ثابت ہوئیں، ایسی مثالیں مغلوں کی حکومت میں کافی ملیں گی، جس سے پتہ چلتا ہے کہ اس زمانہ میں رائے عامہ موثر تھی، اور مغل سلاطین کو ظالم عہدیداروں کے مقابلہ میں عوام کے مفاد کا پورا پورا خیال تھا، شاہجہانی حکومت کے آخری دور میں عدل کے نظام میں کچھ بدعنوانی ضرور پیدا ہو گئی تھیں، اور اس کی ایک بڑی وجہ یہ تھی کہ قاضی کا عہدہ، قاضی کے خاندانوں میں موروثی ہو گیا، اور ایسا کرنے میں مصلحت یہ تھی کہ یہ سمجھا گیا کہ تجربہ کار قاضی اس عہدہ کے لیے اپنے لڑکے کو اچھی تعلیم و تربیت دے سکتے ہیں، لیکن وراثت کی جب روایت قائم ہو گئی تو کچھ خرابیاں پیدا ہو گئیں، اورنگ زیب کے زمانے میں قاضی عبد الوہاب نے رشوتوں سے بڑی دولت جمع کر لی تھی لیکن جب اس کا لڑکا قاضی ہوا تو اس نے پوری دیانت اور صداقت سے اپنے فرائض انجام دیے، اگر قاضی دیانتدار نہ ہوتا تو اس کے خلاف شورش ہوتی، اور لوگ اس کی مذمت کرتے،

مآثر الامرا کے مصنف نے قاضی کی جہالت اور بد دیانتی پر سخت نکتہ چینی کی ہے، قاضی کی کوئی فیس نہ ہوتی، لیکن نکاح اور مہر کے وقت ان کے نذرانے مقرر تھے، جن کو وہ اپنا حق سمجھتے تھے،

قانونی کارروائی بادشاہ کے سامنے کوئی مقدمہ پیش کیا جاتا تو پہلے وہ مدعی کی درخواست پڑھوا کر سنتا، پھر فریقین کو طلب کر کے دونوں کے بیانات کی سماعت کرتا، اس کو سننے کے بعد قانونی مشیروں کے مشورہ سے فیصلہ صادر کرتا، فوجداری کے مقدمات میں قاضی اور صوبے کے ناظم بھی یہی طریقہ اختیار کرتے تھے، دیوانی کے مقدمات میں تحریری ثبوت کے لیے کاغذات پیش کیے جاتے، جن کی بڑی اہمیت ہوتی تھی،

شہادت دینے اور لینے کے مختلف طریقے تھے، یا گواہ پیش کیا جاتا، یا کاغذات سے ثبوت حاصل کیا جاتا، یا جسمانی اذیت کے ذریعہ جھوٹ اور سچ کا اقرار کرایا جاتا۔ اگر گواہ عیسائی ہوتا تو وہ انجیل ہاتھ میں لیکر حلف اٹھاتا، مسلمان کے ہاتھ میں کلام پاک دیا جاتا اور ہندو گائے پر ہاتھ رکھکر شہادت دیتے، اکبر نے مقدمے کی تفتیش کے سلسلہ میں کچھ اصول بھی مقرر کیے تھے، جن کی پابندی اس کے جانشینوں کے عہد میں بھی کی گئی، محکمۂ انصاف کے عہدیداروں کو ہدایت تھی کہ وہ شہادت اور حلفیہ بیانات پر کلی طور پر بھروسہ نہ کریں، بلکہ اپنے فہم اور عقل سے بھی کام لیں، اگر ان کے خیال میں صحیح صورتِ واقعہ معلوم کرنے کا کوئی اور مناسب ذریعہ ہو تو اس کو بھی عمل میں لائیں، ابو الفضل کا بیان ہے کہ اکبر مقدمہ کی تفتیش میں شہادت یا حلفیہ بیان پر زیادہ بھروسہ نہ کرتا تھا کیونکہ اس سے بعض چالاک مدعی اور مدعا علیہ ناجائز فوائد اٹھانے کی کوشش کرتے، بلکہ بادشاہ بیانات کے اختلاف، دعویداروں کے چہرے مہرے کے آثار اور اپنی فہم و فراست سے بھی صحیح نتیجہ پر پہنچنے کی کوشش کرتا تھا، شہزادہ دانیال جب الہ آباد کا گورنر مقرر ہوا تو اس کو ہدایت دی گئی تھی کہ وہ مقدمات میں گواہوں کے بیانات، حلف اور تحریری شہادتوں پر بھروسہ نہ کرے، بلکہ اور مختلف ذرائع سے پوری تفتیش کر کے فیصلے صادر کرے،

عدالت کے لیے سرکاری عمارت ہوتی، جو خاص اسی کے لیے بنائی جاتی، آگرہ میں قاضی کی کچہری قلعہ کے پھاٹک کے باہر تھی، اسی لیے ایک پھاٹک کچہری دروازہ کہلاتا، کچہری کا نام چبوترہ بھی ہوتا، ۹۹۵ھ (۱۵۸۶ء) میں یہ حکم جاری کیا گیا کہ ہندوؤں کے مقدمات قاضی کے بجائے پنڈتوں کے یہاں پیش کیے جائیں، اور اس کے لیے پنڈت مقرر کیے گئے، مقدمات کے فیصلے جلد از جلد صادر کر دیے جاتے، چھوٹے چھوٹے مقدمے تو گاؤں کی پنچایتوں ہی میں طے ہو جاتے، کچھ ضلع کی عدالتوں میں آجاتے، اس طرح دادرسی میں بڑی سہولتیں تھیں، مقدمے پیش کرنے میں موجودہ دور کی طرح بہت سی غیر ضروری رسمی باتوں کی پابندی نہ کرنی پڑتی، اس زمانہ میں کوئی وکیل نہیں ہوا کرتا تھا، اس لیے وکالت کی قابلیت کے اظہار میں وقت ضائع نہیں ہوا کرتا تھا، اس میں شک نہیں کہ عجلت کرنے میں کبھی کبھی صحیح عدل اور جائز انصاف میں چوک ہو جایا کرتی تھی، لیکن ایسی چوک بہت کم ہوتی تھی، اور اگر ہوتی بھی تو ایک بہت بڑی سلطنت میں نظر انداز کیے جانے کے لائق ہے، اکبر کو اس کا بڑا خیال رہا کہ دادرسی میں کسی قسم کی تاخیر نہ ہو، اور اس تاخیر سے بچنے کی خاطر اس نے مذہبی اور غیر مذہبی عدالتوں کی علیحدہ علیحدہ تقسیم کر دی تھی،

اکبر نے ستائیسویں سنہ الٰہی میں اپنے خاص خاص امرا کو بلا کر حکومت کے نظم و نسق کی ترقی اور بہتری کے لیے مشورے کیے تو راجہ بیربل نے اس موقع پر یہ مشورہ دیا کہ کچھ ایماندار اور جفاکش افراد مقرر کیے جائیں کہ وہ اس کی نگرانی کریں کہ مظلوموں کی فریاد صحیح طور پر سنی جاتی ہے، اور عدل و انصاف میں غیر جانبداری برتی جاتی ہے، اور پھر ان معاملات کی تحقیقات کر کے بادشاہ کو باخبر رکھیں، اکبر نے اس مشورہ کو قبول کیا، اور پھر ایک مجلس کی تشکیل کی جس کی صدارت راجہ بیربل کو دی گئی، اور حکیم ہمام، شمشیر خاں اور قاسم علی خاں اس کے ارکان بنائے گئے، اس مجلس کو ہدایت تھی کہ مظلوموں کے مقدمات کی تفتیش میں کوئی رورعایت نہ کی جائے، ظالم اور بے انصاف حکام کے خلاف جو بھی شکایتیں

ہوں، ان کو پوری توجہ سے سنا جائے، یہ گویا عدل و انصاف کی ایک خاص کمیٹی تھی،

خاص خاص صورتوں میں عدل و انصاف کا ایک کمیشن بھی مقرر کیا جاتا تھا، خداداد برلاس کے لڑکے مرزا ابولاد نے مذہبی جوش میں آکر ایک شیعہ کا بازو کاٹ لیا، مجرم گرفتار کیا گیا تو اس نے اپنے جرم سے انکار کیا، اکبر نے اس کی تحقیقات کے لیے ایک کمیشن مقرر کیا جس کے ممبر خانخانان، آصف خاں، خداوند خان اور ابوالفضل تھے، مجرم کا جرم صحیح ثابت ہوا، اور اس کو سخت سزا دی گئی،

اکبر کے رضاعی بھائی خان اعظم مرزا عزیز کوکہ نے اپنے دیوان کو سزا دینے کے لیے ایک ملازم کو حکم دیا، ملازم نے دیوان کو اتنا مارا کہ وہ مرگیا، مرزا کوکہ نے اپنے ملازم کو بھی موت کی سزا دی، لیکن متوفی دیوان کا باپ مطمئن نہیں ہوا، اور اکبر کے پاس جاکر اس کی فریاد کی، اکبر نے قاضی جلال کو اس کی تحقیقات کے لیے مقرر کیا، مرزا کوکہ بیحد خوفزدہ ہوا، اور مستغیث کو قصاص دیکر اپنا مقدمہ اٹھا لینے کے لیے راضی کیا،

جہانگیر کے گیارھویں سال جلوس میں گجرات کے ناظم عبد اللہ خاں بہادر فیروز جنگ کے خلاف وہاں کے بخشی نے بادشاہ کے پاس کچھ شکایتیں لکھ بھیجیں، اس پر ناظم گجرات نے بخشی پر مظالم ڈھائے، جہانگیر کو معلوم ہوا تو اس نے دیانت خاں کو اس کی تفتیش کے لیے مقرر کیا، عبد اللہ خاں کو اس کی اطلاع پہنچی تو اس کے ہوش و حواس جاتے رہے، اور اس نے اپنی تقصیر کا اعتراف کر لیا اور معافی مانگنے کے لیے احمد آباد سے پیادہ پا روانہ ہوا۔

جرائم کی سزا

سزائیں حسب ذیل تھیں: (۱) جرمانے، ضبط جاگیر، منصب اور خطابات سے محرومی، عہدے سے برطرفی وغیرہ، (۲) قید یا نظربندی (۳) جلاوطنی (۴) کوڑے مارنا یا دوسری جسمانی اذیتیں (۵) جسم کے جس حصہ سے جرم کیا جاتا اس کا قطع کر دینا (۶) قتل (۷) شاہی عتاب وغیرہ،

پہلی تین سزائیں تو سرکاری ملازموں کو دی جاتیں لیکن اگر دوسرے مجرم اس کے مستحق ہوتے تو ان کو بھی یہ سزائیں ملتیں، رعایا کے ساتھ اگر ظلم ہوتا یا کوئی سرکاری ملازم اپنے فرائض کی انجام دہی میں کوتاہی کرتا، یا بغاوت اور غداری کرتا تو اس کے لیے سخت سزائیں تھیں۔

(باقی)

آثارِ علمیہ و تاریخیہ

مکاتیب شبلی

اعظم گڈھ کے پرانے ممتاز وکیل مرزا سلیم صاحب مرحوم علامہ شبلی کے عزیز تھے، دونوں میں کبھی کبھی خط و کتابت بھی ہو جاتی تھی، مرزا صاحب مرحوم کے نام کے خطوط اب تک غیر مطبوعہ اور ان کے ورثہ کے پاس محفوظ تھے، یہ خطوط ان کے پوتے اور مولانا شبلی مرحوم کے پوتی داماد شوکت سلطان صاحب پرنسپل شبلی کالج نے ہم کو دیے ہیں، جن کو ایک ادبی و تاریخی یادگار کی حیثیت سے شائع کیا جاتا ہے۔

"م"

برادرم مولوی مرزا سلیم صاحب دام لطفہ

آج بد قسمتی سے آٹھویں کلاس[1] کے لڑکوں نے اسٹرائک کر دی، اور اسکول میں نہیں آئے، کل انسپکٹر صاحب معائنہ کے لیے آئیں گے، تمام منصوبہ غلط ہوا چاہتا ہے، آپ کے سوا یہ معاملہ کسی طرح روبراہ ہوتا نظر نہیں آتا۔

اسٹرائک کا بانی شوکت ایک لڑکا ہے، جس طرح بنے اس کو آمادہ کیجیے کہ مع اور لڑکوں کے کل اسکول میں آجائے، انسپکٹر صاحب کے جانے کے بعد اصل معاملہ پر ہم سب لوگ توجہ کریں گے، اور شوکت کو یقین دلائیے کہ اگر وہ حق پر ہیں تو ہرگز ان کی حق تلفی نہ ہوگی،

مشکل معاملہ ہے، توجہ کیجیے گا۔

شبلی

[1] اس سے مراد شبلی اسکول ہے جواب ڈگری کالج ہے،

از مدرسہ اصلاح المسلمین سرائمیر

۲۷ اگست ۱۹۱۰ء

جناب من

تسلیم۔ سرائمیر کے مدرسہ میں کچھ اختلافات پیدا ہوگئے ہیں، اس لیے بموجب ع

سرچشمہ شاید گرفتن بہ بیل

فوراً تلافی کرنی چاہیے، کل اتوار ہے، میں بھی موجود ہوں، دس بجے کی گاڑی میں آجائیے، تو مشورہ ہو کر سب باتیں طے کر دی جائیں،

شبلی نعمانی

برادر مکرم۔ تسلیم

آپ خواہ مخواہ بدگمانی فرما کر بد دل ہوتے ہیں، میں اس کے سوا کیا کر سکتا تھا، مولوی مشتاق حسین صاحب کو خط لکھا، یہ بھی لکھا کہ وہ لڑکا[1] میرا عزیز ہے، اور آپ اس کو کالج میں داخل کر لیجیے، اس سے زیادہ میں ان پر اور کیا زور ڈال سکتا ہوں، آپ اور کوئی تدبیر فرمائیے تو کروں، یہ بھی تعجب ہے کہ آپ کو اس قدر شدت کیوں ہے، ایک سال بعد پاس ہوا تو کیا ایسا نقصان ہو جائے گا،

شبلی۔ ۱۸ جنوری ۱۹۱۲ء

برادر مکرم

چند طلبہ ندوہ کے وہاں جاتے ہیں کہ سالانہ جلسہ کے لیے لوگوں کو ممبر بنائیں، وہاں آپ کے سوا کون ہے، جو ان کاموں میں سینہ سپر ہو کر کھڑا ہو جائے، ایک مذہبی اور قومی کام ہے

[1] اس سے مراد مرزا سلطان احمد صاحب ہیں جو کئی سال ہوئے بورڈ آف ریونیو کی ممبری سے ریٹائر ہو چکے ہیں۔

جو کچھ ہو سکے کیجئے گا۔

شبلی۔ ۲۷ فروری سنہ ۱۹۱۲ء

لکھنؤ

۲۷ فروری سنہ ۱۹۱۲ء

برادرم

میں نے ڈھونڈھا مجھے تو عزیزی سلطان احمد نہیں ملے، آپ ان کو لکھیے کہ خود مجھ سے اگر ملیں، علی گڈھ کو خط لکھ دوں گا،

شبلی

لکھنؤ، ۲۵ مارچ سنہ ۱۹۱۲ء، ندوہ

جناب من السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ،

آپ کو یہ معلوم ہوگا کہ اس سال ندوۃ العلماء کا سالانہ جلسہ جو چھٹی اپریل سے تین دن تک منعقد ہو گا اسمیں نہایت اہم مذہبی اور قومی مطالب پیش ہوں گے اور ان کے متعلق طریقہ کارروائی آغاز کیا جائیگا، یہ امر بھی قابل اظہار ہے کہ محض اس جلسے کی شرکت کے لیے سید رشید رضا جو مصر و شام کے سب سے بڑے عالم ہیں مصر سے روانہ ہو چکے اور ۲۲ مارچ کو بمبئی میں آجائیں گے، سید صاحب موصوف اس رتبہ کے شخص ہیں کہ جب کبھی ترکی سلطنت میں جاتے ہیں تو گورنمنٹ کیطرف سے اُن کا سرکاری استقبال کیا جاتا ہے،

اس بنا پر ضرور ہے کہ تمام بہی خواہانِ قوم اس موقع پر تشریف لائیں اور جو مشکلات اس وقت قوم کو درپیش ہیں ان کو حل فرمائیں، اس بنا پر میں آپ کی خدمت میں التماس کرتا ہوں کہ آپ ضرور اپنی تشریف آوری سے مجھکو مطلع فرمائیں تاکہ آپکے قیام وغیرہ کا انتظام کیا جائے۔

شبلی نعمانی

ادبیات

قطعہ تاریخ وفات مولوی اقبال احمد خاں صاحب سہیل

از جناب محمد حنیف خاں صاحب

محمد حنیف خانصاحب، اقبال صاحب مرحوم کے خاص دوستوں میں اور انکے کلام کے راوی ہیں، اسکا بڑا حصہ انکے حافظہ میں محفوظ ہے، شعرو ادب کا ستھرا مذاق رکھتے ہیں، جس کا ثبوت یہ قطعہ ہے، "م"

گلزار علم و فن ہمہ بے برگ و بار شد
دورِ خزاں رسیدہ و فصلِ بہار شد

اقبال ازیں خرابہ چو رخت سفر بہ بست
عالم تمام غم زدہ و سوگوار شد

اندر خفا شد، آہ کنوں تابشِ سہیل
بزمِ سخنوراں ہمہ تاریک و تار شد

آں یادگار انجمنِ شبلی و حمید
واحسرتا کہ سوئے عدم رہ گذار شد

از فتنہ و فساد کہ باشد رواج دہر
دامن کشاں بہ رحمتِ پروردگار شد

از جور بیکراں کہ ز دستِ اجل رسید
دامانِ صبر ہر کہ و مہ تار تار شد

اسلام[1] چوں کنم بہ تو پندِ شکیب و صبر
کز صدمۂ فراق دلم خود فگار شد

آں تاجدار ملک سخن از جہاں گذشت

آں شہریار علم بہ دار القرار شد

۵۱ ۶۱۶ ۶۱۴۰ ۶۳۶ ۳۰۴

۱۹۵۵ء

---

[1] اقبال صاحب کے بڑے لڑکے اسلام احمد خاں کی جانب اشارہ ہے،

غزل

از زائرِ حرم جناب حمید صدیقی لکھنؤ

جلوے کسی کے آئینۂ دل میں آگئے
اب حسن و عشق ایک ہی منزل میں آگئے

یوں بے نقاب آج وہ محفل میں آگئے
جیسے سمٹ کے کون و مکاں دل میں آگئے

خوش ہیں شناورانِ محبت، مگر یہ کیا
طوفاں سے بچ کے دامنِ ساحل میں آگئے

اے رہروانِ منزلِ بے نام الوداع
ہم تو حدودِ کوچۂ قاتل میں آگئے

وہ سنگِ زندگی جو زمیں پر بھی بار تھا
کیا جانے کیونکر آپ کی محمل میں آگئے

اٹھتی نہیں ہے کیوں رخِ لیلیٰ سے اب نقاب
ذرّے یہ کس کے گوشۂ محفل میں آگئے

آمادۂ ستیز زمانے سے عشق تھا
یہ کیا کیا کہ آپ مقابل میں آگئے

اللہ رے پردہ داریِ کامل کا اہتمام
آنکھوں سے جب وہ چھپ سکے دل میں آگئے

کچھ امتیازِ شوق، نہ حیرت کی انتہا
ہم اے حمید کونسی منزل میں آگئے

غزل

از جناب چندر پرکاش صاحب جوہر بجنوری

مرا ذوقِ دید شاید ابھی کارگر نہیں ہے
کہ وہ روبرو ہیں لیکن مجھے کچھ خبر نہیں ہے

یہ کمالِ ضبطِ غم ہے کہ سلیقۂ محبت
مرا دل تو رو رہا ہے مگر آنکھ تر نہیں ہے

وہ تمام تر توجہ بایں سازشِ تغافل
وہ یوں باخبر ہیں جیسے انھیں کچھ خبر نہیں ہے

جو نہ کر سکے نظارا وہ ہے آنکھ ننگِ جلوہ
نہ ہو تابِ دید جس میں وہ نظر نظر نہیں ہے

بہت انقلاب آئے بہت آفتاب چمکے
مرے غم کدے میں لیکن ابھی تک سحر نہیں ہے

غمِ جستجو کے صدقے وہ مقامِ دل بھی آیا
کہ بجز خیالِ جاناں کوئی ہمسفر نہیں ہے

نہیں یہ جنون سجدہ پھر اور کیا ہے جوہر
کہ وہاں بھی رکھ دیا سر جہاں انکا در نہیں ہے

مطبوعات جدیدہ

مشاہدات۔ از جناب ہوش بلگرامی تقطیع چھوٹی، ضخامت ۴۸۴ صفحات، کاغذ، کتابت، طباعت بہتر، قیمت مجلد عہ، پتہ: مکان نواب ہوشیار جنگ مرحوم، خیرت آباد، حیدرآباد دکن۔

یہ کتاب حال ہی میں شائع ہوئی ہے، اور چند ہی مہینے ہوئے ریویو کے لیے آئی تھی، مگر ابھی اسکی نوبت نہ آسکی تھی کہ خود مصنف کی کتاب زندگی کا ورق آخر ہوگیا، وہ اردو زبان کے خوش مذاق ادیب تھے، ان کی زندگی کا بڑا حصہ والیان حیدرآباد و رامپور کی مصاحبت اور دفتری کاموں میں گذرا، اس تعلق سے امراء و والیان ملک سے لیکر متوسط اور ادنیٰ ہر طبقہ کے آدمیوں سے انکا سابقہ رہا، اور ان کو ان کی نفسیات اور سیرت و کردار کے مطالعہ اور ریاستوں کی پیچیدہ سیاست اور اس کے جوڑ توڑ کے مشاہدے کا پورا موقع ملا، انھوں نے مشرقی درباروں کا جاہ و جلال اور دولت و امارت کے جلوے بھی دیکھے اور غربت و افلاس کی پستیاں بھی، الطاف خسروانہ کا بھی مزہ چکھا اور اس کی تلخیاں بھی برداشت کیں، جاہ پرستوں کی خود غرضیوں کا بھی تجربہ ہوا، اور سادہ لوحوں کی نادانیوں کا بھی، اصحاب علم سے بھی واسطہ رہا اور دولت مند جاہلوں سے بھی، اسلامی تہذیب کے آخری مرکز حیدرآباد کا عروج بھی دیکھا، اس کی طفلانہ سیاست اور عبرتناک انجام بھی، غرض ان کو زندگی کے نشیب و فراز اور سرد و گرم کا بڑا وسیع تجربہ ہوا، ان تمام تجربات اور مشاہدات کو انھوں نے کتابی صورت میں مرتب کر دیا ہے، اس سلسلہ میں مصنف کی سرگذشت اور ان کے مذہبی اور سیاسی خیالات وغیرہ بھی آگئے ہیں، اس لیے یہ کتاب مختلف قسم کے تجربات و مشاہدات اور تاریخی حالات

واقعات کی نہایت دلچسپ کشکول ہے، جس میں ہر مذاق کی باتیں ملتی ہیں، جن سے لطف بھی حاصل ہوتا ہے اور سبق بھی، مصنف ایک اچھے انشاء پرداز تھے، اس لیے انداز بیان کی خوبی نے اس تاریخی سرگذشت میں ناول اور افسانے کا رنگ پیدا کر دیا ہے، اگرچہ مصنف کی تحریروں میں بڑا نشیب و فراز ہے اور انکے بعض خیالات میں کلام اختلاف کی گنجائش ہے لیکن مجموعی حیثیت سے کتاب بہت دلچسپ ہے۔

ضرورت حدیث - از جناب قاضی محمد زاہد الحسینی صاحب تقطیع چھوٹی، ضخامت ۴۰ صفحات، کاغذ، کتابت وطباعت بہتر، قیمت ۶؍ پتہ دار الاشاعت والتبلیغ، شمس آباد، ضلع اٹک مغربی پاکستان

یہ کتاب منکرین حدیث کے جواب میں لکھی گئی ہے، انکار حدیث کی تردید میں اتنا لکھا جا چکا ہے، اور اس کے ہر پہلو پر اتنا ذخیرہ فراہم ہو چکا ہے کہ اب اس سلسلہ میں مشکل ہی سے کوئی نئی بات کہی جا سکتی ہے اور اب جو کتابیں لکھی جاتی ہیں، ان میں بیشتر ان ہی پرانی باتوں کو تھوڑے ترمیم و اضافے کے ساتھ دہرا دیا جاتا ہے، یہ کتاب بھی اسی قسم کی ہے، اس میں منصب نبوت اور اتباع رسول کی دینی حیثیت، حدیث کی اہمیت، اس کی حجیت اور صحت وغیرہ کو ثابت کیا گیا ہے، اور منکرین حدیث کے مشہور اعتراضوں کا جواب دیا گیا ہے، اس حیثیت سے یہ کتاب فائدے سے خالی نہیں ہے، مگر اس میں منکرین حدیث کے مقابلہ میں یہ غلو ہے کہ خبر احاد اور سنت متواترہ میں کوئی فرق نہیں کیا گیا ہے، اور مطلق حدیث کو ہر حیثیت سے کلام اللہ کا درجہ دیدیا گیا ہے، دونوں کو ایک ہی قسم کی وحی مانا گیا ہے یعنی دونوں کے معنی الہامی اور الفاظ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مانے گئے ہیں، اس کے علاوہ کلام مجید کی بہت سی خصوصیات حدیث کے لیے ثابت کی گئی ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو شارع مطلق مانا گیا ہے اور یہاں تک لکھا گیا ہے کہ کلام مجید کا بڑا حصہ آپ کے دیے ہوئے احکام اور آپ کی رائے کی تائید میں نازل ہوا ہے، اس قبیل کے اور بھی خرافات ہیں، حدیث کی صحت کے ثبوت میں صحیح دلائل کے ساتھ مضحک دلائل بھی دیے گئے ہیں، مناظرانہ

کتابوں میں اصل چیز اعتدال و توازن کا قائم رکھنا ہے، جو اس کتاب میں بالکل مفقود ہے اور اس میں ہر حیثیت سے حدیث کو کلام مجید کے برابر کر دیا گیا ہے، اس لیے اس میں فائدہ کے ساتھ ضرر کا پہلو بھی ہے، مباحث میں جا بجا علمی کے بجائے واعظانہ داستان گوئی کا رنگ آگیا ہے۔

تاریخ ادبیات عربی - از جناب سید ابو الفضل صاحب ایم اے عثمانیہ تقطیع چھوٹی، ضخامت ۴۰ صفحات، کتابت وطباعت معمولی، قیمت سے، پتہ: سب رس کتاب گھر، خیریت آباد، حیدر آباد دکن،

عربی ادبیات اور اس کے علوم و فنون کی تاریخ پر اردو میں کوئی مستقل کتاب نہیں ہے، عربی میں قدیم و جدید دونوں قسم کی متعدد کتابیں موجود ہیں، انگریزی میں بھی بعض اچھی کتابیں لکھی گئی ہیں، مصنف نے ان کی مدد سے یہ کتاب مرتب کی ہے، اور اس کا بڑا حصہ جرجی زیدان کی تاریخ آداب اللغۃ العربیہ سے ماخوذ بلکہ اسی کی تلخیص ہے، اس کے بعد کی تاریخ مصنف کا اضافہ ہے، مگر وہ نہایت مختصر اور تشنہ ہے، اس کتاب میں عہد جاہلیت سے لیکر موجودہ زمانہ تک ہر دور (عہد جاہلیت اسلام، خلافت راشدہ، اموی عباسی، مغل عثمانی اور دور جدید) کی علمی ترقیوں اور علوم و فنون کی مختصر تاریخ ہے جس میں اس دور کی خصوصیات اور اس کے مشہور مصنفین اور ان کی کتابوں کا تذکرہ ہے، عربی علوم و فنون کی وسعت کے مقابلہ میں یہ کتاب بہت مختصر ہے، مگر اردو میں اتنے معلومات بھی ایک جگہ نہیں مل سکتے، اس لیے یہ کتاب بھی غنیمت ہے۔

اصول تفسیر - ترجمہ مولانا عبد الرزاق صاحب ملیح آبادی، تقطیع چھوٹی، ضخامت ۱۱۲ صفحات، کاغذ، کتابت وطباعت بہتر، قیمت ۱۲؍ پتہ: مکتبہ سلفیہ شیش محل روڈ، لاہور۔

ہر فن کی طرح فن تفسیر کے بھی کچھ اصول و شرائط ہیں، جن کی پابندی کے بغیر تفسیر میں غلطی کا امکان رہتا ہے، مختلف فرقوں کی تفسیروں میں جو اختلافات اور فاش غلطیاں پائی جاتی ہیں وہ ان ہی اصولوں کے نظر انداز کرنے کا نتیجہ ہے، اس لیے ترجمان القرآن علامہ ابن تیمیہ نے اصول تفسیر پر ایک رسالہ لکھا تھا،

جس میں اس کے اہم اصول وشرائط اور تفسیر میں غلطی کے اسباب بیان کیے گئے ہیں، مذکورہ بالا رسالہ اسی کا اردو ترجمہ ہے، اس میں دکھلایا گیا ہے کہ تفسیر کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ قول رسول اور مفسر قرآن صحابہ اور تابعین کے اقوال کی روشنی میں کیجائے، چنانچہ عہد سلف میں جب تک اس کا لحاظ رہا تفسیری اختلافات بہت کم پیدا ہوئے اور ان کی نوعیت بھی بہت خفیف تھی، پھر جب اس اصول سے ہٹ کر تفسیر بالرائے شروع ہوئی تو اختلافات بڑھتے گئے اور اسکی نوعیت بھی سنگین ہوتی گئی حتی کہ بدعتی فرقوں نے رکیک تاویلوں سے آیات قرآنی کا مفہوم ہی بدل دیا، اس کی وضاحت مثالوں سے کی گئی ہے، اور اس سلسلہ میں تفسیری احادیث و روایات پر تبصرہ کیا گیا ہے، اور ان کے رد و قبول کے اصول بتلائے گئے ہیں، اور تفسیری اغلاط کے اسباب میں بدعتی فرقوں کی تفسیروں سے استدلال کی غلطیاں واضح کی گئی ہیں، پھر تفسیر کا صحیح طریقہ بتلایا گیا ہے، یہ اس رسالہ کے مباحث کا اجمالی خاکہ ہے، اور اس کی تفصیل میں تفسیر کے تمام اہم اصول وشرائط آگئے ہیں، یہ رسالہ اگرچہ مختصر ہے مگر بہت مفید ہے، اس کے ناشر جناب مولوی عطاء اللہ صاحب نے حواشی میں رسالہ کے اجمالی اشارات کی تشریح کردی ہے، جو بہت مفید ہے، ترجمہ کی خوبی کے لیے فاضل مترجم کا نام کافی ہے،

کشت خیال - از جناب رضی احمد صاحب رضی، تقطیع جیبی، ضخامت ۸۰ صفحات، کاغذ کتابت وطباعت بہتر، قیمت قسم اول عہ، دوم عہ، پتہ سید ذکی احمد، ٹیڑھی گھاٹ، پٹنہ سٹی:

مصنف بہار کے خوش مذاق شاعر ہیں، کشت خیال ان کی غزلوں کا مجموعہ ہے، چند قطعات بھی ہیں، مجموعہ کی ترتیب تاریخ وار ہے جس سے عہد بعہد کی ترقی کا اندازہ ہوتا ہے، ابتدائی کلام میں قدرۃً خامی ہے، مگر آخری دور کے کلام میں خیالات اور طرز ادا دونوں میں پختگی نمایاں ہے اور کلام کا عام رنگ ستھرا ہے،

"م"

جلد ۷۷ ماہ جمادی الثانی ۱۳۷۵ھ مطابق فروری ۱۹۵۶ء عدد ۲

فہرست مضامین